سمندر میں چھلانگ

مؤلف

شیخ محمد عطاء الرحمن مدنی

دانشکدہ پبلی کیشنز

سمندر میں چھلانگ

مؤلف

شیخ محمد عطاء الرحمن مدنی حفظہ اللہ

دانشکدہ پبلی کیشنز
مئوناتھ بھنجن، یوپی

سلسلۂ کتاب 4

ناشر کا کتاب کے جملہ مشمولات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

نام کتاب : سمندر میں چھلانگ

مؤلف : شیخ محمد عطاء الرحمن مدنیؒ

طابع وناشر : دانشکدہ پبلی کیشنز متوناتھ بھنجن یوپی

سن طباعت : 2022ء

تعداد : 1100

تعداد صفحات : 162

ڈسٹری بیوٹر : مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی

ISBN: 978-93-84037-21-5

Samundar men chhalang

Written By

Shaikh Muhammad Ataur Rahman Madni

ملنے کے پتے:

☆ فہیم بکڈپو، صدر چوک مئو
☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
☆ نعیمیہ بکڈپو، جامع مسجد دیوبند
☆ مکتبہ عکاظ، دیوبند
☆ مکتبہ ترجمان، اہل حدیث منزل، جامع مسجد دہلی
☆ الہدیٰ پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲
☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڈھ
☆ ایم۔آر پبلیکیشنز، نئی دہلی ۲
☆ کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، دہلی
☆ الحسنات بکس، سرسید احمد خاں روڈ، دریا گنج نئی دہلی

DANISH KADA PUBLICATIONS

Head Off.: 2982, PGF, NeelKanth Street Qaziwara, Daryaganj, New Delhi-11002

Branch: Domanpura, Teliyana, Mau N.B-275101 (U.P.)

Email: danishkadamau@gmail.com

9336010224, 9236761926

انتساب
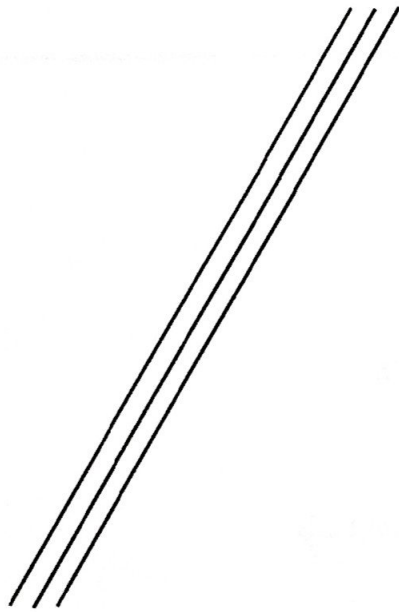
اپنے اُن اعزہ، احباب اور ساتھیوں کے نام
جنہوں نے میرے مدرسہ فیضِ عام چھوڑتے وقت مئوناتھ بھنجن ریلوے اسٹیشن پر
آبدیدہ نگاہوں سے مجھے
الوداع کہا تھا!

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
تاثرات	7
پیش لفظ	11
ہماری مشترکہ تمنائیں اور مشترکہ جدوجہد	19
ایک غیر ارادی تحریک برائے سفر بلادِ عربیہ	22
ایک عجیب ہنگامی انقلاب	26
عربستان کا خواب مگر جیب میں صرف بارہ روپے	29
بے پر اُڑنے کی کوشش	35
اپنی زندگی میں پہلی نظر بندی	38
بمبئی ریلوے اسٹیشن گیٹ پر کرشمہ خداوندی	40
سمندر پار کرنے کی کوشش اور احتیاطی تدابیر	43
بحری جہاز میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش	48
بلاٹکٹ و پاسپورٹ سمندر کا دس روزہ سفر	51
جدہ میں جہاز سے اترنے کی ایک ناکام کوشش	60
قبل اس کے کہ مجھے کوئی مجرم کہہ کر گرفتار کرے	65
جہاز پر چند گھنٹوں کی نظر بندی	67
پورٹ سوڈان اور جہاز کے اوپر سے وہاں کے مناظر کا تفریحی مشاہدہ	69

رہائی کی تمنائیں	70
جہاز سے فرار کے منصوبے	72
جدہ سے مکہ مکرمہ کے لیے پیدل روانگی	86
اِمدادِ خداوندی کا ایک عجیب وغریب طریقہ	89
حجاز میں دینی وسیاسی مدوجزر	96
حجاز پر سعودی قبضہ اور اس کا پس منظر	96
حرم مکی ومدنی کی توسیع	97
حجاز میں اصلاحی کارنامے	98
سعودیہ میں امن وسکون کا احساس	100
مکہ مکرمہ پہنچ کر مدرسہ خیریہ عارفیہ میں داخلہ	101
مدرسہ دارالحدیث مکہ مکرمہ میں داخلہ	106
حج وعمرہ	108
غارِ حرا	109
غارِ ثور	112
سعودی عرب کے المعہد العلمی ریاض میں داخلہ	118
جامعہ مظہر العلوم بٹنہ مالدہ سے پہلی سند فراغت	125
طالب علمی کے ویزا پر ریاض سعودی عرب کا باضابطہ سفر	128
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ	133
ہندوستانی طلبہ کی نمائندگی	134
مدینہ منورہ میں کھرے کھوٹے چند دوستوں کی پہچان	136
مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع سے ایک خاندانی رشتہ	155
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے سند فراغت	159

تأثرات

جناب مولانا محمد سلیمان صاحب میرٹھی

''میرے مضمون کو پڑھ میرے لفافے کو نہ دیکھ''

پیش نظر کتاب ایک آپ بیتی ہے۔ایک علمی سفر ہے جو ایک علم کے جویا نے اپنے گھر، اپنے علاقے اور وطن سے شروع کیا اور صحیح معنوں میں وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی عملی تصویر بن گئے:

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

دریا نہ چھوڑنے کی حقیقت تو کتاب کے مطالعہ سے قاری پر واضح ہو جائے گی جب وہ پڑھے گا کہ کتاب کا مصنف بحر احمر میں تیر کر ہی اپنا گوہر مقصود پا سکا، لیکن بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کا مفہوم بھی اس وقت صادق آجاتا ہے جب طلب علم کا شوق کشاں کشاں اسے درسگاہوں تک لے جاتا ہے اور وہاں سے بیگانے نہیں بلکہ یگانے جبر وظلم کا ریکارڈ توڑتے ہوئے پکڑ کر گھر لاتے ہیں اور پابند طوق وسلاسل کرتے ہیں۔

اس نے یہ سارے مرحلے ہنسی خوشی برداشت کیے اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے مطلوب ومقصود سے کبھی غافل نہیں رہا۔ یہ گھریلو اور خاندانی سختیاں اس کو حصولِ علم کے شوق سے الگ و پابہ زنجیر نہ کرسکیں، بلکہ موقع پاتے ہی وہ وہیں پہنچتا جہاں تشنگانِ علوم اپنی سیرابی کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اس نے ثابت کر دیا کہ حالات کی

تأثرات

جناب مولانا محمد سلیمان صاحب میرٹھی

''میرے مضمون کو پڑھ میرے لفافے کو نہ دیکھ''

پیش نظر کتاب ایک آپ بیتی ہے۔ایک علمی سفر ہے جو ایک علم کے جویا نے اپنے گھر، اپنے علاقے اور وطن سے شروع کیا اور صحیح معنوں میں وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی عملی تصویر بن گئے:

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

دریا نہ چھوڑنے کی حقیقت تو کتاب کے مطالعہ سے قاری پر واضح ہو جائے گی جب وہ پڑھے گا کہ کتاب کا مصنف بحر احمر میں تیر کر ہی اپنا گوہر مقصود پا سکا، لیکن بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کا مفہوم بھی اس وقت صادق آجاتا ہے جب طلب علم کا شوق کشاں کشاں اسے درسگاہوں تک لے جاتا ہے اور وہاں سے بیگانے نہیں بلکہ یگانے جبر وظلم کا ریکارڈ توڑتے ہوئے پکڑ کر گھر لاتے ہیں اور پابند طوق وسلاسل کرتے ہیں۔

اس نے یہ سارے مرحلے ہنسی خوشی برداشت کیے اور کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنے مطلوب ومقصود سے کبھی غافل نہیں رہا۔ یہ گھریلو اور خاندانی سختیاں اس کو حصولِ علم کے شوق سے الگ و پابہ زنجیر نہ کرسکیں، بلکہ موقع پاتے ہی وہ وہیں پہنچتا جہاں تشنگانِ علوم اپنی سیرابی کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اس نے ثابت کردیا کہ حالات کی

ناسازگاری اور راہ کی مشکلات جذبہ صادق کے آڑے نہیں آتیں۔ صرف ضرورت ہے اس فرمانِ الٰہی کے مصداق بننے کی:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

دنیا اس شخص کو شیخ محمد عطاء الرحمن مدنی کے نام سے جانتی ہے۔ جنہوں نے اپنے علم وعمل سے صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ افریقہ میں بھی ہدایت کا نور پھیلایا۔ موصوف بروقت مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے شعبۂ افتاء (مجلس تحقیق علمی) کے سربراہ بھی ہیں۔

طلاقِ ثلاثہ کے موضوع پر موصوف ہی کی طرف سے وہ معرکۃ الآراء فتویٰ منظر عام پر آیا تھا جس نے اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ایک تہلکہ مچا دیا اور ذرائع ابلاغ، ریڈیو اور ٹی وی نے بھی اس کی بھرپور تشہیر کی، مختلف زبانوں کے اخبارات وجرائد میں اس موضوع پر اتنا لکھا گیا کہ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ ایک تہائی صدی کی مدت میں کسی مذہبی موضوع پر اتنا عوامی اظہارِ خیال نہیں کیا گیا۔ الحمد للہ! اس سے ایک جمود ٹوٹا اور سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے مدبر وروشن خیال شخصیت نے یہاں تک لکھ دیا کہ جمعیت اہل حدیث نے کتاب وسنت کے اس موقف کو ایک بار پھر منظر عام پر لاکر عوام الناس پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ وقت کی ضرورت تھی جسے پورا کیا گیا۔

مصنف موصوف نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات اور ان واردات کو قلمبند کیا ہے جو انہیں پیش آچکے ہیں۔ یقیناً یہ بڑا کام تھا جو کیا گیا۔ یہ آپ بیتی دوسری تمام آپ بیتیوں سے مختلف ہے۔ اس میں الفاظ کی چاشنی، سطحی ادبیت کا معیار اور طرزِ نگارش میں وہ زیر وبم شاید نہ دکھائی دے جو کچھ لوگ تلاش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت بیانی میں فطری سادگی کا وہ عنصر جھلکتا ہے جو صرف خاصانِ خدا کا خاصہ ہے۔ پیش آمدہ حالات وواقعات کو بلاکم وکاست نقل کردیا ہے اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی گئی کہ ظاہرداری وتصنع کے کن کن تقاضوں سے یہ میل نہیں کھاتا۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

میرے خیال میں یہ طرزِ فکر اور اندازِ تحریر موجودہ دور کے مادہ پرستانہ ماحول میں عنقا ہو چکا ہے۔ آج تو ہر چیز کو مصلحت کے رنگ میں ڈبو کر سیاسی حکمت عملی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حقیقت کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔

اس کتاب میں واقعات کا تسلسل قاری کے ذہن پر حیرت و تجسس کے اثرات چھوڑتا ہے اور یہ کیفیت کہیں کہیں اسے بیتابی کے مرحلے تک پہنچا دیتی ہے۔ میرے خیال میں یہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

کتاب کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے مفید ہے، بالخصوص علمائے دین اور طالبانِ علومِ دینیہ اس کے اولین مخاطب ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے عامۃ الناس کے فائدے کے لیے یہ آپ بیتی قلمبند فرمائی۔

محمد سلیمان میرٹھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد:

یہ میری اپنی داستان ہے، اس میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں درحقیقت یہ وہ واقعات ہیں جو چند سال قبل مجھے طالب علمی کے زندگی میں پیش آئے۔ بالفاظ دیگر یہ میری طالب علمانہ زندگی کا دوسرا مرحلہ ہے جس کی ابتدا سنہ ۱۹۵۵ء ہی میں ہو چکی تھی جب میں مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن میں زیر تعلیم تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب میرے دل میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی تمنائیں انگڑائیاں لے رہی تھیں اور چند دوستوں کے ساتھ اس سلسلے میں خط وکتابت بھی شروع کر چکا تھا۔

اس مرحلہ میں یوں تو بہت سارے حیرت انگیز قسم کے واقعات پیش آئے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، لیکن مشیت الٰہی سے ایک ایسا واقعہ بھی پیش آ گیا جو خداداد خصوصی ہمت وشجاعت سے تعلق رکھتا تھا اور وہ تھا میرا بحر احمر کی بندرگاہ جدہ میں رات کے وقت جہاز سے چھلانگ لگا کے تین ساڑھے تین کیلومیٹر سمندر میں تیر کر ساحل تک پہنچنے کا عزم۔

اس واقعہ کے ڈھائی سال بعد جب ہندوستان واپس ہوا تو لوگ مجھے اس کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ میں نے ایک دو بار تو دلچسپی کے ساتھ بیان کر دیا، لیکن اس کے بعد اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ ایک واقعہ کو بار بار دہرانا باعث اکتاہٹ ہوتا ہی ہے۔ جہاں بھی ملاقات کے لیے جاتا کسی نہ کسی عزیز یا بزرگ کی طرف سے فوراً مطالبہ پیش

ہوتا کہ اپنی ''داستانِ بحر'' سنایئے۔ یہ واقعہ جس قدر پریشان کن تھا اس کا بار بار بیان کرنا میرے لیے اس سے بھی زیادہ پریشان کن ثابت ہونے لگا اور بارہا یہ خیال آیا کہ کاش ایک ٹیپ میں اسے ریکارڈ کرلیا ہوتا تو ہر شخص کی خواہش پوری ہوجاتی اور مجھے طوطے کی طرح ایک بات کو بار بار دہرانے کی زحمت نہ ہوتی۔

بہر حال وہ ایک وقت تھا آیا اور گزر گیا۔ اس کے بعد کئی بار خیال آیا کہ اس دور کے سارے واقعات قلمبند کرلیے جائیں جس طرح اس سے قبل والے دور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کئی بار کاغذ وقلم لے کر بیٹھا بھی، لیکن اس سوچ میں رہا کہ کس طرح شروع کیا جائے، دو چار سطروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اب جب کہ میں افریقہ پہنچ گیا ہوں اور لکھنے سے بھی دلچسپی بڑھنے لگی ہے، تو پھر وہ خیال پارینہ عود کر آیا اور اللہ پر بھروسہ کرکے یہ عزم کرلیا کہ تھوڑا وقت نکال کر اسے قلمبند کرلیا جائے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اس سے پہلا مرحلہ قلمبند کرنے کے بارے میں ابھی ابھی جو اِشارہ کیا گیا ہے، وہ کتابی شکل اختیار کرچکا تھا، لیکن افسوس کہ آخری شکل میں اسے محفوظ نہ رکھ سکا!

شاید آپ کہیں گے کہ بھئی! کیا بات ہے، کیوں پچھتا رہے ہو؟ لیکن میرے محترم! بات صرف پچھتانے ہی کی نہیں دلخراش بھی ہے۔ اسے وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جنہیں اپنی کسی تالیف کے ضائع ہونے کی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔

میری جائے پیدائش ضلع پورنیہ صوبہ بہار کا آخری مشرقی علاقہ ہے، جو صوبہ بنگال کے ضلع مالدہ سے متصل ہے۔ یہاں کے اکثر لوگ بنگلہ زبان جانتے اور بولتے ہیں۔ شاید یہ علاقہ کسی زمانے میں بنگال کا حصہ رہا ہو یا بنگال سے کچھ لوگ آکر ادھر آباد ہوگئے ہوں۔ اس علاقہ میں بہت سارے بنگالی اسکول بھی پائے جاتے تھے اور میرے گاؤں کے قریب جو اسکول تھا وہ بھی بنگالی اسکول تھا۔ چنانچہ میری تعلیم کی ابتدا بنگالی زبان سے ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ جسے میں اپنی تعلیمی زندگی کا پہلا مرحلہ کہتا ہوں اس کے سارے واقعات بنگالی زبان میں قلمبند کیے گئے ہیں اور اس کا نام ''بدیائے بپود'' رکھا یعنی تحصیل علم میں پیش آمدہ مصائب۔

مذکورہ کتاب لکھنے تک تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں مجھے جن جن مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا میں نے انہیں من و عن اس میں درج کر دیا تھا، خاص کر مجھے اپنے خاندان کے افراد سے جو اذیتیں برداشت کرنی پڑیں انہیں میں نے نہایت صاف گوئی سے بیان کر دیا تھا۔ جب اس کتاب کی تبییض کر رہا تھا تو ایک آدھ گھنٹہ کے لیے وہ کتاب میرے والد صاحب کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس طرح انہیں کتاب کا موضوع معلوم ہو گیا اور وہ مجھ پر بہت برہم ہوئے، گویا انہیں اپنے خاندان کا خانۂ مسجد مسمار ہوتا نظر آرہا تھا۔

کچھ روز کے بعد گاؤں کے چند معتبر لوگوں کے ایک مختصر اجتماع میں باپ اور بیٹا کے درمیان صلح صفائی کی بات چیت کے دوران یہ مسئلہ بھی پیش ہوا کہ اس نے ایک کتاب میں فلاں فلاں باتیں لکھی ہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے ہماری صلح کیسے ہو سکتی ہے؟ پنچایت کے بعض لوگوں نے مصالحت کے لیے تجویز پیش کی کہ وہ کتاب ہی ختم کر دی جائے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ کتاب یہاں لا کر سب کے سامنے نذرِ آتش کر دی جائے۔ مجھے بادل نخواستہ لوگوں کی بات ماننی پڑی اور کتاب لا کر مجمع کے حوالہ کر دی گئی۔

پھر کیا ہوا...... آپ نہ پوچھئے، کتاب پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے کتاب کے اوراق پر آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اس پنچایت میں یہ بھی طے پایا تھا کہ اس کا جو مسودہ میرے پاس ہے بعد میں میں اُسے بھی نذرِ آتش کر دوں، لیکن اس دردناک آتش زنی کے باوجود مطلوبہ صلح صفائی کا دوسری جانب سے کوئی عملی اِظہار نہیں ہوا، اس لیے میں نے بھی اس کتاب کے مسودہ کو نذرِ آتش کرنے کے بجائے دوبارہ اس کی تبییض کا ارادہ کر لیا اور اللہ کے فضل سے آج تک وہ بحفاظت میرے پاس موجود ہے۔ اگر چہ وہ مسودہ کسی بھی مناسب وقت پر کتابی شکل اختیار کر سکتا ہے، لیکن وہ حسن ترتیب اور مناسب ترمیمات' جن کے لیے میں نے بہت محنت کی تھی، کہاں سے لاؤں !!

یہ بھی ایک عجیب کتاب ہے کہ اسے آگ سے کھیلنا پڑا اور اپنے اوراق پر بھڑکتے ہوئے

شعلوں کی حرارت سے اپنے لکھنے والے کے دل کو بھی موم کی طرح پگھلا دیا۔

اس کتاب کے نام ہی سے اس کا موضوع آپ کے ذہن میں آ گیا ہوگا۔ لیکن اس کی چند مخصوص جھلکیاں آپ کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرسکتی ہیں، جن سے آپ کو میری داستانِ خونچکاں یا ایک طویل و مشکل سفر کا نقطہ آغاز معلوم ہو جائے گا اور آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے یا لکھ رہا ہوں وہ خودستائش ہے یا امر واقعہ۔

''میں بنگالی اسکول میں پرائمری کے آخری کلاس تک پہنچنے ہی والا تھا کہ مجھے تعلیم سے باز رکھنے کے لیے میرے بعض کرم فرما قرابت داروں کی طرف سے جبر و تشدد شروع ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے کسی روز اسکول پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو دوسرے روز پھر نگرانی ہونے لگتی ہے۔ کسی روز راستہ ہی سے ڈانٹ پلا کر واپس کر دیا جاتا ہوں یا کتاب و کاپیاں رکھوا کر کسی گھریلو کام میں لگا دیا جاتا ہوں۔ گھر سے کبھی چپکے سے نکل کر کسی ساتھی کے گھر پہنچ جاتا ہوں اور اس کے تیار ہونے تک وہیں چھپا رہتا ہوں۔ ادھر میرے کرم فرماؤں کی طرف سے میری تلاش جاری رہتی ہے۔ جب میں راستے میں نظر نہیں آتا تو وہ تلاش کرتے ہوئے میرے ساتھی کے گھر تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں اور سہمے ہوئے ان کے ساتھ واپس آنے کے لیے جھک کر اپنے پاؤں کے جوتے سنبھالنے لگتا ہوں، اوپر سے میری پیٹھ و گردن پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔''

''اس قسم کے برتاؤ کی وجہ سے تعلیم جاری رکھنا میرے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ میں بنگالی اسکول چھوڑ کر، جس میں ماہانہ فیس دینی پڑتی تھی، اپنے والد صاحب کے اشارے پر اپنے گاؤں کے عربی مکتب میں داخل ہو جاتا ہوں کہ شاید یہاں فیس نہ لگنے کی وجہ سے میری پڑھائی کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ لیکن یہاں بھی میرے کرم فرما اقارب میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بالآخر میں مجبوراً تعلیم کو خیرباد کہہ کر گھریلو کام کاج میں لگ جاتا ہوں۔ والد صاحب نے بھی میرے چچا کے مخالفانہ مزاج کو دیکھ کر میری پڑھائی پر مزید زور نہیں دیا۔ اگرچہ میں بظاہر تعلیم چھوڑ دیتا ہوں، لیکن دل میں تعلیم کی فکر رچی بسی رہتی ہے۔ کچھ روز کے بعد گھریلو کام

کے سلسلے میں اپنے ہی گھر کے بعض نوکروں سے میری کچھ نوک جھونک ہو جاتی ہے، جسے میں بہانہ بنا کر گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ قریب و دور کے بعض رشتے داروں کے یہاں گھوم پھر کر آخر میں مدرسہ اصلاحیہ سیما پور (جو کٹیہار شہر کے قریب ہے) پہنچ جاتا ہوں۔ یہ اپنے گھر سے لگ بھگ ۲۴/۲۳ میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں میری پڑھائی باقاعدہ شروع ہو جاتی ہے۔ اپنے پاس تعلیم وملابس کے اخراجات کے لیے روپیہ پیسہ نہ رہنے کی وجہ سے کچھ روز بعد مجھے گھر واپس جانا پڑتا ہے، لیکن مدرسہ واپس آنا جلد میسر نہیں ہوتا۔''

''اس بار پروگرام یوں بنتا ہے کہ گھر سے پیسے و کپڑے اس قدر لے لیے جائیں کہ چند سال تک اس سلسلہ میں مطمئن رہ سکوں۔ پیسے تو ہاتھ نہ لگے، البتہ کچھ روز کے بعد چند مناسب کپڑے لے کر رات کے وقت گھر سے نکل پڑتا ہوں اور اسی سابق مدرسہ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اپنے انہیں کرم فرما چچاؤں میں سے ایک آکر مجھے گھر واپس لے جاتے ہیں۔ چند روز گھر رہ کر پھر مدرسہ بھاگ جاتا ہوں، لیکن کچھ وقفے کے بعد ایک اور چچا صاحب جا کر کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے گھر واپس لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ شام کو گھر پہنچتا ہوں، لیکن صبح سویرے فجر سے پہلے ہی گھر سے غائب ہو جاتا ہوں اور شام تک مدرسہ آکر اپنی پڑھائی میں لگ جاتا ہوں۔ اس بار میرے ایک اور چچا بہت غصے میں ہوتے ہیں اور مجھے پکڑنے کے لیے دوسرے روز ہی مدرسہ پہنچ جاتے ہیں۔ اتفاق سے میں کسی ضرورت کے تحت مدرسہ کے سامنے راستہ پر نکل آتا ہوں تو چچا ایک چھوٹی سی مضبوط چھڑی یا ڈنڈا ہاتھ میں لیے سامنے نظر آتے ہیں اور میرے گھٹنے پر ایک ڈنڈا رسید کر دیتے ہیں، میں جھک کر گھٹنا سہلانے لگتا ہوں تو دوسرا ڈنڈا میرے سر پر پڑتا ہے اور سر میں چکر سا محسوس کر کے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا ہوں۔ چند لمحے بعد جب ہوش میں آتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے و گھسیٹتے جا رہے ہیں۔ جوں ہی میرا پورا شعور واپس آجاتا ہے میں اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا ان کے ساتھ چلنے لگتا ہوں اور شام کی ٹرین سے گھر پہنچ جاتا ہوں۔''

''اس بار مدرسہ لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اب میں گھر سے کچھ پیسہ لے کر بہت دور

بھاگنے کو سوچتا رہتا ہوں، تاکہ اطمینان سے اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سو بیگھے سے زیادہ اپنی زراعتی زمین تھی، کئی کئی نوکر بھی کام کاج کے لیے رکھے ہوئے تھے اور کپڑے کی دوکان بھی چلتی تھی۔ پروگرام کے مطابق ایک روز صبح سویرے والد صاحب کے بکس کا تالا توڑتا ہوں اور تین سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی ہاتھ لگ جاتی ہے۔ میں اسے لے کر نو دو گیارہ ہو جاتا ہوں، لیکن بدقسمتی سے راستہ ہی میں پکڑ لیا جاتا ہوں۔ گھر واپس آنے پر زدوکوب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر اسی روز شام کو خالی ہاتھ گھر سے نکل جاتا ہوں اور پھر اسی مدرسہ میں جا کر پڑھائی شروع کر دیتا ہوں۔''

''کچھ روز بعد میرے چچا مشترکہ جائداد کے حصے بخرے کر کے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس پر میرے پاس والد محترم کا خط پہنچتا ہے۔ خط میں اپنی پدرانہ محبت وشفقت کی یاددہانی کراتے ہوئے مجھے گھر واپس بلاتے ہیں۔ میں خط پڑھتا ہوں، والد صاحب کی پدرانہ شفقت کے تذکرہ پر آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ آیا پڑھائی جاری رکھوں یا چھوڑ کر گھر واپس چلا جاؤں۔ اس کشمکش میں کچھ روز گزر جاتے ہیں۔ اب والد صاحب خود مدرسہ تشریف لاتے ہیں اور میری رہائش گاہ پر پہنچ کر مجھے سمجھا بجھا کر ایک خاص پروگرام کے تحت مجھے گھر واپس لے جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر والد صاحب پانچ چھ روز تک مجوزہ پروگرام کے مطابق خود عمل کرتے ہیں اور میری رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے بعد اچانک پروگرام بدل دیتے ہیں، جو کام مجھ سے لینا تھا وہ کام میرے چھوٹے بھائی سے لینے لگتے ہیں جبکہ پروگرام کے مطابق میرے چھوٹے بھائی کو تعلیم کے لیے مدرسہ بھیج دینا چاہیے تھا، لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا۔''

''مجوزہ پروگرام کی اس تبدیلی نے میرے اندر پھر سے یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ پڑھائی کے لیے گھر کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ مناسب وقت آیا اور میں نے رات کے اندھیرے میں رخت سفر باندھ لیا۔ اس بار ایک نئے مدرسہ کا رُخ کیا جس کا نام جامعہ مظہر العلوم بٹنہ ہے اور بنگال کے ضلع مالدہ میں واقع ہے۔ یہاں بھی والد صاحب کا ایک خط پہنچتا ہے اور جلد از جلد

مجھے گھر واپس پہنچنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ مگر ناظم جامعہ مولانا عبدالحکیم صاحب (رحمہ اللہ) سے مشورہ کر کے گھر کی واپسی کو موخر اور پڑھائی کو مقدم کرنے کا عزم کر لیتا ہوں۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے جمعرات وجمعہ کی چھٹی میں مزدوری کرنے لگتا ہوں تا کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ کسی لمبی چھٹی میں اپنے مخصوص دوست مولوی عبیداللہ کے ساتھ ان کے گھر "تیمیر پورا" (ضلع مالدہ، کومید پور اسٹیشن کے قریب) چلا جاتا ہوں۔ پھر ان سے عذر کر کے ایک انجان گاؤں میں جا کر نوکری تلاش کرتا ہوں، لیکن وہاں کے لوگ میری درخواست یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ تم نوکری یا مزدوری کرنے والے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ شام کو ناکام اسی دوست کے یہاں واپس آ جاتا ہوں، لیکن انہیں میری اس کارروائی کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد کچھ اور احباب سے ملتے ملاتے چھٹی ختم کر کے جامعہ واپس جاتا ہوں اور یہاں لگ بھگ چار سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ جامعہ چھوڑ دیتا ہوں۔"

"اب کی سالانہ چھٹی گھر پر ہی گزارنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ گھر میں والد صاحب کی ناراضگی وخاموشی کی ملی جلی فضا میں بڑی مشکل سے چھٹی گزارتا ہوں۔ چھٹی ختم ہوتے ہی چند ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن میں داخلہ لیتا ہوں اور یہاں میری تعلیمی زندگی کا پہلا مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔"

خیال ہے کہ پہلا مرحلہ سے متعلق کتاب بدیائی بیپودکو اردو، عربی اور ہندی کا بھی جامہ پہنا دیا جائے، لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کب ہوگا اور کس طرح ہوگا؟

اخیر میں ایک بات قارئین کرام کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ادب کو بہت زیادہ پسند کرنے کے باوجود خود ادیب نہیں ہوں، اس لیے اگر آپ میری تحریر میں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان نہ پا سکیں تو برائے کرم اس سلسلہ میں مجھے معذور سمجھیں گے۔ البتہ ایک دیہاتی یا بدوی انداز کے کاتب کی طرح افہام وتفہیم اور واقعات کی عکاسی کے لیے ان شاء اللہ العزیز ہر ممکن کوشش جاری رکھوں گا۔

ایک آخری نقطہ یہ بھی عرض ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے سے یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ دوسرے لوگ بھی میری نقل اتارنی شروع کر دیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ دوسروں کی اچھی باتوں سے استفادہ کرے اور غلطیوں سے پرہیز۔ میں نے تعلیمی زندگی کا جو سفر شروع کیا تھا وہ بہت حد تک شاق ودشوار گزرا ہے، لیکن خدا کے فضل سے کسی بھی موقع پر میں نے صبر وتحمل اور استقلال واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس سفر کے طے کرنے میں میں نے جن طریقوں کو اپنایا، ضروری نہیں کہ وہ سب صحیح ہوں یا سب غلط، لیکن حالات وظروف کے پیش نظر میں نے انہیں صحیح یا اُھون البلیتین سمجھ کر ہی اختیار کیا تھا، وہ مجھے مفید بھی معلوم ہوئے اور انہی پر چل کر میں نے اپنے آپ کو منزل مقصود کے قریب تر محسوس کیا۔

دعا ہے کہ اللہ ہمیں اور آپ کو ہر وقت اور ہر موقع پر نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے اور صبر واستقامت کی دولت سے نوازے۔ آمین

راقم

محمد عطاء الرحمن مدنی

اِلورِن، نائیجیریا

۱/۸/۱۹۷۱ م

ہماری مشترکہ تمنائیں اور مشترکہ جدوجہد

یہ ۵۶۔۱۹۵۵ء کی بات ہے جب میں مدرسہ فیض عام مئوناتھ بھنجن میں زیر تعلیم تھا۔ یہاں رسالہ ''الاعتصام'' برابر پہنچ رہا تھا۔ اس میں سعودی عرب کے دارالسلطنت ریاض کا ایک نیا قائم شدہ تعلیمی ادارہ ''المعہد العلمی'' کے بارے میں جناب مولانا محمد شریف اشرف کا لکھا ہوا تفصیلی مقالہ نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے ادارہ مذکور کے تعلیمی نظم ونسق، طلباء سے متعلق خصوصی رعایت وسہولت اور وہاں کے تعلیمی معیار و مستقبل کے بارے میں نہایت ہی سیر حاصل اور دلچسپ باتیں لکھی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ کے پڑھنے کے بعد کوئی بھی طالب علم ایسا نہیں رہا ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا انگڑائی نہ لی ہو کہ کاش! میں بھی وہاں پہنچ جاتا اور اس معہد میں داخلہ لے سکتا!! میں بھی ایسے ہی طالب علموں میں سے ایک تھا۔

اگر چہ دوسروں کی طرح میرے دل میں بھی یہ تمنا جگہ بنا چکی تھی، لیکن یہ میرے دل کی حدودِ اربعہ کے اندر محصور نہ رہ سکی، بلکہ موقع ومحل کی مناسبت سے بعض احباب کے سامنے بھی آ گئی۔ مثل مشہور ہے کہ بات سے بات نکلتی ہے، دوسرے احباب کے دل میں جو تمنائیں پنہا تھیں وہ بھی باہر نکل آئیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور یوں ہم پانچ طلبہ اس سلسلے میں ہم خیال بن گئے۔ ایک تو راقم الحروف، دوسرے جناب عبدالحق صاحب ڈلا بیرٹال، تیسرے جناب محمد سعید صاحب گارڈ ٹولہ، چوتھے جناب محمد حسین لال گولہ مرشد آباد اور پانچویں جناب مشرف حسین صاحب مالدہی تھے۔

ہم جس جگہ رہتے ہیں یہ کوئی جنت نہیں کہ جس چیز کی تمنا ہو وہ فوراً حاضر ہو جائے۔ یہ دنیا ہے، یہاں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدو جہد شرط ہے اور یہ شرط بھی کوئی منطقی شرط نہیں کہ اگر شرط پوری ہوگئی تو مشروط کا وجود لازمی ہو جائے۔ یہاں جدو جہد کے بعد کوئی کامیاب ہوتا ہے تو کوئی ناکام بھی رہتا ہے۔ جدو جہد کے بعد توفیق الٰہی جس کا ساتھ دے وہی کامیاب ہوسکتا ہے۔

بہر حال، ہم پانچوں احباب نے مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کے لیے کچھ جدو جہد کی جائے اور اس کی آسان صورت یہ ہوگی کہ ہم ایک مشترکہ درخواست بنام جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز بواسطہ سعودی سفیر مقیم نئی دہلی، بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جناب مصطفی اعظمی ازہری کے مشورہ وتعاون سے عربی زبان میں ایک درخواست تیار کی گئی، اس میں ہم نے اپنی تمناؤں کا اظہار کیا اور واضح کردیا کہ ہم خود اپنے اخراجات سے بلادِ عربیہ پہنچنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اس لیے اگر جلالۃ الملک اپنی خصوصی مہربانی وشفقت سے ہمارے وہاں پہنچنے اور داخلہ دلانے کے لیے کوئی انتظام فرمادیں تو ہم بہت زیادہ ممنون ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے یہ درخواست سعودی سفیر جناب یوسف فوزان کی خدمت میں بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک نئی دہلی روانہ کردی۔ سفیر موصوف نے جواب دیا کہ آپ لوگوں کی درخواست جلالۃ الملک کے پاس بھیج دی گئی ہے، جواب آنے پر آپ لوگوں کو مطلع کردیا جائے گا۔ اس جواب سے ہماری ہمت افزائی تو بہت ہوئی، لیکن جلالۃ الملک کے جواب کا انتظار ہمارے لیے نہایت ہی صبر آزما ثابت ہونے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہم نے سفیر موصوف سے جلالۃ الملک کے جواب کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ ہم نے پہلے جواب میں ہی لکھ دیا تھا کہ جلالۃ الملک کا جواب آنے پر مطلع کردیں گے۔ آپ کو انتظار کرنا چاہیے۔ بلافائدہ آپ اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ اس جواب کے بعد پھر ہم مزید استفسار کی ہمت نہ کرسکے اور یوں ہی بے چینی میں دن گزرتے رہے۔

انہی دنوں جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز کا ہندوستان آنے کا پروگرام بن گیا اور یہ معلوم ہوا کہ آپ بنارس بھی جائیں گے۔ اس خبر سے ہماری تمنائیں پھر انگڑائیاں لینے لگیں اور ساتھیوں کی طرف سے یہ تجویز ہوئی کہ ہم میں سے کوئی بنارس جائے اور کسی طرح جلالۃ الملک سے ملنے کا موقع پاتے ہی اپنی درخواست کی یاددہانی کردے، شاید اس طرح ڈوبتوں کو تنکے کا سہارا مل جائے۔

لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' ملنا تو درکنار جلالۃ الملک کا چہرہ تک نہ دیکھ سکے۔ بنارس سے واپسی کے بعد ہماری تمنائیں دھیمی پڑنے لگیں اور کچھ روز کے بعد تو گویا نسیاً منسیاً ہوگئیں۔

ایک غیر ارادی تحریک

برائے سفر بلادِ عربیہ

جن ایام میں ہم بلادِ عربیہ جانے کا خواب دیکھ رہے تھے اتفاق سے انہی دنوں ہندوستان میں جبری تعلیم کے قوانین اور یکساں کورس کے نفاذ کے تجربے ہو رہے تھے۔ اس کورس کی چند کتابیں میں نے بھی دیکھیں۔ ان میں ہندو نظریات کو ذہن نشین کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ مسلم طبقہ میں اس موضوع پر چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں، کیونکہ وہ کورس ہندو مسلم تمام بچوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔

ایک روز شام کو مدرسہ کے چند احباب قصبہ مئو کے باہر سرسبز وشاداب کھیتوں کی طرف پیدل تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ عام تفریحی گفتگو کے ساتھ ساتھ جبری تعلیم کے بارے میں بھی بحث چھڑ گئی اور میں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تفریح سے واپس آنے کے بعد جبری تعلیم کے متعلق اسی گفتگو کو بنیاد بنا کر اسی موضوع پر ایک تنقیدی مقالہ لکھ ڈالا اور اسے مسلم اسٹوڈنٹس کمیٹی کی ایک قرارداد کے نام سے تیار کیا، جس کا ماحصل یوں تھا:

”مئو میں مدرسہ فیض عام کے مسلم اسٹوڈنٹس کمیٹی کا ایک ہنگامی اجتماع منعقد ہوا، شرکائے اجتماع نے جبری تعلیم کے کورس کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے اسے مسلمان بچوں کے لیے مضر وگمراہ کن قرار دیا۔ کمیٹی کے سرگرم رکن جناب محمد عطاء الرحمن بہاری نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ایک موثر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ جبری تعلیم کا یہ کورس جو ہندو مسلم تمام بچوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا، صرف ہندو تہذیب کو اجاگر کرتا ہے، یہ

مسلمان بچوں کے لیے نہایت ہی مضر و گمراہ کن ہیں۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، کسی ایک خاص مذہب والوں کا ملک نہیں۔ یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا مساوی حق ہے۔ یہاں دستور کی رُو سے کسی مذہب کے عقائد دوسرے مذہب والوں پر زبردستی تھوپنے کی اِجازت نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ اس کورس میں یک طرفہ پالیسی اختیار کی گئی ہے؟ اس میں ہندو بزرگوں کی سوانح تو شامل کی گئی ہیں لیکن مسلمان بزرگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ انگریز نے ہندوستان پر حکومت کرتے وقت ہندو اور مسلمان دونوں کو نقصان پہنچانے کی پالیسی اختیار کی تھی، لیکن موجودہ آزاد حکومت کا اس کورس کے سلسلے میں یک طرفہ جبری پالیسی مسلمانوں کے حق میں انگریزی مظالم سے کچھ کم نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اخیر میں آپ نے حاضرین کے سامنے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی:

۱۔ مسلم اسٹوڈنٹس کمیٹی حکومت سے پُرزور اپیل کرتی ہے کہ جبری کورس کی کتابوں میں مناسب ترمیم کی جائے۔

۲۔ مسلمان سلف صالحین و بزرگوں کی سوانح و کارنامے بھی اس کورس میں شامل کیے جائیں۔

یہ قرارداد باتفاق آراء پاس کی گئی جس کی ایک کاپی صدرِ جمہوریہ اور دوسری کاپی وزیر اعظم کے نام بھیج دی گئی۔''

اس مقالہ کے شائع ہونے سے مدرسہ کے سارے افراد خوش تھے۔ چند روز کے بعد سالانہ امتحان ہوا۔ خدا کے فضل سے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا اور بطور اول انعام مجھے ''مقدمہ تحفۃ الاحوذی'' بھی ملی۔ اس کے بعد سالانہ تعطیل ہو گئی اور ہم لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

مذکورہ مقالہ ''آزاد ہند'' نامی اخبار میں شائع ہونے کے بعد حکومت کی خفیہ مشنری حرکت میں آ گئی۔ میں نے جس مسلم اسٹوڈنٹس کمیٹی کے حوالہ سے مقالہ لکھا تھا اس کمیٹی کی تلاش شروع ہو گئی اور مدرسہ میں چھٹی ہونے کے بعد خفیہ پولیس مدرسہ تک پہنچ گئی، لیکن مدرسہ والوں نے

اسے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا کہ یہ محمد عطاء الرحمن کا اپنا ذاتی فعل ہے جو سراسر فرضی ہے۔ اس سے مدرسے کے دیگر طلباء کا کوئی تعلق نہیں وغیرہ۔

خفیہ پولیس کے واپس جانے کے بعد مدرسہ کی طرف سے مجھے مندرجہ ذیل قسم کا خط موصول ہوا:

''چونکہ آپ نے ایک غلط اور بالکل فرضی قرارداد منجانب اسٹوڈنٹس کمیٹی مدرسہ فیض عام بغرض اشاعت بھیجی تھی، جس کی بنا پر مدرسہ کو ناحق پریشانی ہوئی اور جواب دہ ہونا پڑا، نیز آپ کے اس فعل سے مدرسہ کو ٹھیس پہنچی، اس لیے حسب حکم جناب ناظم صاحب آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ آئندہ سال مدرسہ میں آپ کا داخلہ نہیں ہوگا، آنے کی ضرورت نہیں، فقط۔

مختار احمد، خادم مدرسہ فیض عام مئو۔''

سالانہ تعطیل ختم ہونے ہی والی تھی اور ہماری پڑھائی کا نیا سال شروع ہوا چاہتا تھا۔ دیگر ساتھی مدرسہ جانے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، لیکن میں شش و پنج میں تھا کہ اس خط کے بعد مدرسہ میں میرا پھر سے داخلہ ممکن ہے بھی یا نہیں؟ اس بارے میں میں نے اپنے مشفق استاذ اور سگے ماموں مولانا ابوبکر ہارونی (رحمہ اللہ) سے، جو میری تعلیمی سرپرستی کے سلسلے میں میرے مخلص مشیر تھے، مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے ہمت دلائی اور فرمایا کہ زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، تم مدرسہ جا سکتے ہو، میں ایک سفارشی خط لکھ دیتا ہوں، امید ہے کہ مدرسہ والے پھر سے تمہیں داخلہ دے دیں گے، لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ آئندہ جب بھی تم کوئی مقالہ لکھ کر اخبار میں دینا چاہو اور اس میں کوئی جواب دہ قسم کی باتیں ہوں تو اسے نہ مدرسہ کے حوالے سے لکھو اور نہ اپنے نام سے، بلکہ اس کے لیے تم کوئی اور غیر معروف یا فرضی نام اختیار کر سکتے ہو۔ اس طرح تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا اور کسی پر کوئی جوابدہی بھی عائد نہیں ہوگی۔

ماموں صاحب کی ہدایت کے مطابق سفارشی خط لے کر میں مدرسہ حاضر ہو گیا۔ ناظم صاحب کو خط دے کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے، تمہارا داخلہ منظور

کرلیا جائے گا بشرطیکہ تم خود بھی ایک اقرار نامہ لکھ دو کہ میں آئندہ کوئی ایسی بات مدرسہ کے حوالے سے کسی اخبار میں شائع نہیں کراؤں گا جس سے مدرسہ پر کوئی آنچ آئے۔

میں نے اس قسم کا ایک اقرار نامہ لکھ کر ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے اس پر موافقت کا دستخط کر دیا اور فرمایا کہ یہ خط نائب صدر کے پاس لے جاؤ اور ان سے دستخط کرا کے پھر میرے پاس لانا، ان شاء اللہ کل تمہارے داخلے کی ساری کارروائیاں مکمل کر دی جائیں گی۔

میں وہ کاغذات لے کر نائب صدر کے پاس پہنچا۔ وہ بھی ان کاغذات کو اچھی طرح دیکھ بھال کر دستخط کر دیے۔ اب میں ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے ناظم صاحب کے گھر کا رخ کیا تاکہ حسب ہدایت یہ انہیں آج ہی پہنچا دوں اور کل سے میری پڑھائی شروع ہو جائے۔

ایک عجیب ہنگامی انقلاب

نائب صدر کے یہاں سے ناظم صاحب کے گھر کی طرف ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ یک بیک خیال میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔اب دماغ میں یہ بات گشت کرنے لگتی ہے کہ میں نے جو مقالہ لکھا تھا وہ کسی حد تک فرضی ہی سہی، لیکن قانون کے خلاف تو نہیں تھا، کیونکہ قانون کی رو سے ہر ہندوستانی اپنی حکومت کی کارروائی پر تنقید کرنے کا حق رکھتا ہے۔اگر اس کی وجہ سے مدرسہ کو کچھ جواب دہی کر کے معاملہ کو رفع دفع کرنا پڑا تو آئندہ کے لیے مجھے سمجھا سکتے تھے اور تنبیہ بھی کر سکتے تھے کہ پھر کبھی مدرسہ کے حوالے سے ایسا نہ کروں، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ میرا داخلہ ہی بند کر دیا گیا، دوبارہ داخلہ کے لیے سفارش پیش کرنی پڑی، اقرار نامہ لکھ کر دینا پڑا، پھر منظوری وموافقت کے لیے یہاں وہاں دوڑ کر دستخط کرانے پڑے...... چلو اب میں ایسا داخلہ لیتا ہی نہیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ اب میں بقیہ تعلیم سعودی عرب جا کر ہی پوری کروں۔ یہ حج کا موسم ہے، بمبئی میں اپنے اطراف کے معلم سے رابطہ قائم کر کے سمندر پار کرنے کے لیے کوئی بھی مناسب تدبیر سوچی جا سکتی ہے۔

یہ خیالی انقلاب بھی ایک عجیب انقلاب تھا۔نہ گھر سے نکلتے وقت اس بارے میں کچھ سوچا تھا اور نہ مدرسہ پہنچنے کے بعد ہی ایسی کوئی گفتگو ہوئی تھی۔دوبارہ داخلہ کی منظوری کے لیے دوڑ دھوپ کرتے وقت بھی ذہن خالی تھا، حتی کہ منظوری کے آخری دستخط حاصل کرنے تک بھی ذہن اس سے ناآشنا تھا۔پھر یہ کیسا انقلاب!!اس کے کیا اسباب ہیں، میں نہیں بتا سکتا۔گزشتہ سال اس سلسلے کے خط وکتابت میں ضرور حصہ لیا تھا،لیکن اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ اب

وہ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا اور ہم اسے تقریباً بھول چکے تھے۔ اگر یہاں دوبارہ داخلہ کی گنجائش نہیں نکلتی تو کہا جا سکتا تھا کہ اسی وجہ سے دوسری جگہ کا خیال پیدا ہوا۔ حالانکہ داخلہ کی منظوری کے آخری دستخط شدہ کاغذ ہاتھ میں موجود تھے، اس کے باوجود یہ کایا پلٹ ہوئی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس کا ناطہ کس سے جوڑا جائے؟

ہاں، اس منظوری کے لیے کچھ دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی، لیکن اتنی دوڑ دھوپ تو ابتدائی داخلہ کے لیے بھی کرنی پڑتی ہے، بلکہ کسی جگہ اس سے بھی زیادہ، چنانچہ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم اس انقلاب کا ناطہ اس سے جوڑ سکیں۔ انھی وجوہات کی بنا پر میں اسے ایک عجیب انقلاب سے تعبیر کرتا ہوں، اب آپ اسے جو جی چاہے کہہ سکتے ہیں۔

ذہن میں اس نئے خیال کے آتے ہی میری چال دھیمی پڑ گئی، اب میں ناظم صاحب کے گھر جانے اور ان سے ملاقات کرنے میں تردد محسوس کرنے لگا کہ یہ کاغذات ناظم صاحب کو پہنچاؤں یا نہیں، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جب کہ ناظم صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ نائب صدر کے دستخط کے بعد یہ کاغذات مجھے واپس کر دینا۔ پھر اب کیا کیا جائے؟ آخر دل ہی دل میں یہ طے کیا کہ کاغذات تو حسب ہدایت ان کو ضرور پہنچا دینے چاہئیں، اس لیے ان کے گھر تک جانا ضروری ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ دعا بھی کرنے لگا کہ خدا کرے اس وقت ان سے ملاقات نہ ہو، کیونکہ اگر ملاقات ہوگئی اور انہوں نے کوئی مزید حکم صادر فرما دیا تو پھر مجھے اس نئے حکم سے چھٹکارا پانے کے لیے مزید پاپڑ بیلنا پڑے گا۔ بہر حال، ناظم صاحب کے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو ایک چھوٹا لڑکا آیا اور کہا کہ ناظم صاحب سو رہے ہیں۔ ان سے براہ راست ملاقات نہ ہونے پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کاغذات اس لڑکے کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ ناظم صاحب کو دے دینا اور کہہ دینا کہ یہ کاغذات ایک طالب علم دے گیا اور سلام عرض کر کے واپس چلا گیا۔

میں خوش و خرم وہاں سے سیدھا مدرسہ پہنچا اور ساتھیوں کے کمرے میں جہاں میرا سامان رکھا ہوا تھا، داخل ہوگیا۔ چونکہ میں نے عزم کر لیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جو گاڑی یہاں سے

بنارس جانے والی ہے، اسی سے روانہ ہو جاؤں گا، اس لیے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ میں نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ ساتھیوں سے ابھی اس نئے خیال کو چھپائے رکھوں گا، کیوں کہ اگر ابھی یہ کہہ دوں کہ میں سعودی عرب کے لیے روانہ ہو رہا ہوں تو وہ لوگ مجھے الوداع کہنے کے بجائے پاگل خانہ لے جا کر بند کرا دیں گے اور میرے دماغی علاج کی سوچیں گے۔ کیوں کہ نہ میرے پاس ایسے سفر کے لیے پیسہ ہے، نہ ہی بروقت کہیں سے میں اتنا پیسہ حاصل کر سکتا ہوں، ایسی حالت میں اس طویل سفر کے لیے یک بیک اُٹھ کھڑا ہونے پر اگر یہ لوگ مجھے پاگل نہ سمجھیں تو خود انہیں کے دماغ محتاجِ علاج سمجھے جا سکتے ہیں۔

عربستان کا خواب
مگر جیب میں صرف بارہ روپے

سلام کر کے ساتھیوں کے کمرے میں داخل ہوا اور میں نے اپنا سامان سنبھالنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ میری یہ حرکت دیکھ کر پوچھنے لگے کہ بھئی! یہ کیا بات ہے! تم تو ابھی داخلہ کی منظوری لینے گئے تھے!! بتاؤ داخلہ کا کیا ہوا؟ میں نے بتایا کہ داخلہ تو ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ اس مدرسہ سے دل بھر گیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اتنی جلدی کس لیے؟ کہاں جانا چاہتے ہو؟

چونکہ اصل سفر کے اختتام پر انتظامی سہولت کے لیے بنارس کے مولانا عبدالمجید صاحب حریری سے ایک رقعہ حاصل کرنے کا خیال تھا، اس لیے ساتھیوں کے جواب میں یہ کہہ کر اپنے اصل مقصد کو چھپا لیا کہ بنارس مدرسہ رحمانیہ جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت سمجھایا، میرے خاص دوست جناب سعید صاحب گارڈ ٹولہ، ماموں زاد بھائی جناب افسر الدین صاحب اور ایک عزیز مقبول حسن گارڈ ٹولہ جو وہاں پہلی بار پہنچے تھے، سب کے سب اصرار کرنے لگے کہ جب داخلہ منظور ہو گیا ہے تو یہیں رہ جاؤ، لیکن میں کہاں ماننے والا تھا، میرا دل تو کسی اور جگہ پہنچ چکا تھا، پھر جسم یہاں کیسے رہ سکتا تھا؟ میں نے کہا: بھائیو! اب میں کسی قیمت پر یہاں نہیں رک سکتا، آپ لوگ براہِ کرم مجھے نہ روکیں۔ ان شاء اللہ العزیز حیات باقی تو ملاقات باقی۔

میں اپنا بوریا بستر اگول کر چکا تھا۔ میرے ہم سبق احباب کو یہ بات معلوم ہو چکی۔ ان میں سے نیپال ضلع کپل وستو جھنڈا نگر کے جناب حقیق اللہ صاحب، جناب عبدالرحمٰن صاحب،

ہندوستان بستی کے جناب عبدالحنان صاحب، شہر مئو کے جناب مظہر صاحب، جناب ابومظہر صاحب اور جناب مظفر صاحب یہ خبر سنتے ہی میرے پاس پہنچ گئے اور میری اس دیوانگی پر اظہارِ افسوس کرنے لگے۔

بہرکیف، اب دیر کرنا فضول تھا۔ٹرین کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔میں نے ایک رکشا طلب کیا اور سامان اُٹھا کر رکشا کی طرف بڑھا،لیکن دوستوں نے سامان میرے ہاتھ سے لے لیا اور میں رکشا کی طرف بڑھنے لگا۔میں نے دو تین مخصوص حضرات کے علاوہ باقی احباب کو الوداعی سلام کیا،لیکن وہ لوگ میرے سلام کو ابھی الوداعی سلام ماننے کے موڈ میں نہیں تھے۔یہ لوگ میرے رکشے کے پیچھے دیگر کئی رکشوں پر بیٹھ کر مئو ناتھ بھنجن ریلوے اسٹیشن کی طرف آنے لگے۔ان کے علاوہ بھی اور دو چار احباب اسٹیشن پہنچ گئے۔میں نے جلدی سے بنارس کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

سگنل گر چکا تھا۔تمام احباب میرے گرد جمع تھے۔میں اب تھوڑی ہی دیر بعد ان سے جدا ہونے والا تھا۔ان احباب سے جدا ہونا مجھے بہت شاق گزر رہا تھا،لیکن ایک اہم مقصد کی خاطر اسے میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔میں نے بہت زیادہ کوشش کی کہ کسی طرح بھی اس جدائی کے رنج وغم کا کوئی اثر میرے چہرے پر ظاہر نہ ہونے پائے،لیکن اس کوشش کے باوجود میں اس میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

ادھر ساتھیوں کا حال یہ تھا کہ میں ان کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا کہ مبادا میری آنکھیں بھی ان کی ہمنوائی نہ کر بیٹھیں،سب کی آنکھیں نم تھیں،بعض نے تو اپنے رومالوں سے اپنی آنکھوں کو خشک کرنے کا عمل جاری رکھا ہوا تھا،لیکن بعض کی آنکھیں یوں آنسو بہا رہی تھیں جیسے وہ آنکھیں نہیں آبشار ہیں۔عزیزم مقبول حسین کا حال ناگفتہ بہ تھا،وہ ہم میں سب سے چھوٹا تھا،وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہچکیاں لے لے کر بآواز بلند رو رہا تھا،جتنا سمجھاؤں اتنا ہی زور پکڑتا جاتا تھا،گویا اس جدائی کا سارا غم اسی کے سر پہ ٹوٹ پڑا ہو۔

اب گاڑی پہنچ جاتی ہے،لیکن احباب کی اس ہیجانی کیفیت میں کمی کے بجائے اور شدت

پیدا ہوجاتی ہے۔گاڑی اپنی روانگی کی سیٹی بجانے لگتی ہے اور میں احباب سے آخری الوداعی مصافحہ کر کے گاڑی میں داخل ہوجاتا ہوں۔گاڑی حرکت کرتی ہے اور کھڑکی سے ہم ایک دوسرے کو ہاتھوں کے اشارے سے الوداعی سلام کرتے ہوئے چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ان کے غائب ہوتے ہی میرے رکے ہوئے آنسوؤں کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور منٹوں میں رومال تر ہوجاتا ہے۔

احباب نے اس طرح الوداع کر کے اپنی رفاقت کا پورا پورا حق ادا کردیا، بلکہ حق سے کچھ زیادہ ہی محبت وخلوص کا بوجھ میرے اوپر ڈال دیا، جس کے لیے میں ان کا تا زندگی مقروض رہوں گا۔یہ لوگ اسٹیشن تک آکر مجھے رخصت تو کر گئے، لیکن میرے دل میں الفت ومحبت اور خلوص کا ایک ایسا نقش ثبت کر گئے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔اس واقعہ کے گزرے ہوئے لگ بھگ چودہ سال ہورہے ہیں، لیکن آج اسے قلمبند کرتے وقت جب وہ منظر سامنے آتا ہے تو دل میں ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جیسے میں اب بھی ان کے افسردہ وغم آلود چہروں اور پُرنم آنکھوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں اور کسی کے رونے کی آواز سن رہا ہوں، اور آج بھی جب اس تنہائی میں کرسی پر بیٹھے اور میز پر ٹیک لگائے یہ واقعہ لکھ رہا ہوں، جی چاہتا ہے کہ دل کے آنسو بہا کے احباب کے اس روز کا کچھ قرض چکا دوں۔

یہ تو دل کی خواہش تھی، لیکن آنکھوں نے جھٹ اس پر عمل کرنا بھی شروع کردیا اور تنہائی میں آنسوؤں کے چشمے بہا دیے۔ممکن ہے میرے احباب ان چشموں کا عکس اپنے دل کے اندر محسوس کر رہے ہوں۔ہندوستان آکر میری آپ بیتی کو ۱۹۹۴ء میں میرے چھوٹے لڑکے ''سعود'' نے کمپیوٹرائز کردیا ہے، لیکن اس کی تصحیح کمپیوٹر پر میں خود ہی کر رہا ہوں اور تصحیح کرتے ہوئے آج مورخہ ۲۳/۹/ ۱۹۹۴ء کو جب ان دوستوں کے الوداعی واقعہ پر اصلاحی نظر ڈالنے لگا تو پھر دل اور آنکھوں نے ایک دوسرے سے ساٹھ گانٹھ کر کے آنسوؤں کے چشمے بہانے شروع کردیے۔کاش کہ میں اپنی زندگی میں آنسوؤں کے ان چشموں کی اُن احباب کو کتابی شکل میں سیر کرا سکوں!!!

خیر، یہ ایک تاثر تھا جو اس واقعہ کی تصویر کشی کے وقت دل پہ طاری ہوا تھا۔ بروقت ہمارا موضوع بنارس کا سفر ہے۔ گاڑی پہنچ گئی۔ میں اپنا سامان لے کر اُتر گیا۔ گیٹ سے گزر کر ایک رکشا پر بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو مدنپورہ کا مدرسہ رحمانیہ چلنے کی ہدایت کی۔ مدنپورہ پہنچ کر مدرسہ رحمانیہ کے ہوسٹل کے سامنے رکشا روکا اور ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔

سامان ہاتھ میں لے کر ہوسٹل کے اندر داخل ہوا۔ یہاں ایک سابق معروف دوست جناب سجاد الرحمن کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ ان کے علاوہ وہاں ایک اور معروف دوست جناب عبدالوہاب صاحب بھی تھے۔ سب کو سلام کیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پُرتپاک استقبال کیا۔ سامان رکھ کر ہم نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ میں اس سے قبل مدرسہ فیض عام مئو میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اب سامان سمیت مجھے دیکھ کر مشتبہ انداز میں پوچھنے لگے کہ آپ پورے سامان کے ساتھ کیسے؟ آخر بات کیا ہے؟ کیا فیض عام کو خیر باد کہہ دیا؟ میں نے کہا: بات کچھ ایسی ہی ہے۔ پھر سوال ہوا کہ اب کیا ارادہ ہے؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟

اس سوال کا جواب مجھے ذرا غور سے دینا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی کو میرا اصل مقصد معلوم ہو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جائے۔ میں نے اخفائے راز کی خاطر انہیں یوں جواب دیا کہ اب مدرسہ رحمانیہ میں داخلہ لینے کی کوشش کروں گا اور داخلہ کے لیے یہاں آیا ہوں۔ انہوں نے پھر کہا کہ اب تو داخلہ کا وقت ختم ہو چکا ہے، پتہ نہیں اس وقت یہاں کے ذمہ داران داخلہ منظور کریں گے بھی یا نہیں۔ میں نے یہ سن کر کہا بہرحال کوشش کر کے دیکھوں گا، اگر یہاں نہیں ہوا تو اور کہیں کا رُخ کروں گا۔

دوسرے دن شام کو مناسب وقت پر بنارس سے متعلق اپنے اصل مقصد کے لیے مارکیٹ گھومنے کے بہانے نکل پڑا اور مولانا عبدالمجید صاحب حریری کے مکان پر پہنچا۔ ایک لڑکے سے کہا کہ مولانا کو خبر کر دو کہ بہار ضلع پورنیہ (کٹیہار) کا ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کچھ دیر مولانا کی بیٹھک میں انتظار کیا۔ سب سے پہلے ایک پیالی چائے پہنچی۔ میں چائے

پی ہی رہا تھا کہ مولانا صاحب تشریف لائے۔علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا: فرمایئے کیسے آنا ہوا؟ میں نے انہیں رازدارانہ طور پر اپنا اصل مقصد بتایا اور آخر میں یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے سعودی عرب تک پہنچادے تو وہاں کسی مدرسہ میں داخلہ اور ٹھہرنے کے سلسلے میں میں آپ کا تعاون چاہتا ہوں۔آپ وہاں پہلے رہ چکے ہیں، چنانچہ وہاں آپ کے کچھ جاننے والے بھی ہوں گے۔اگر آپ براہِ کرم اپنے کسی دوست کے نام میرے بارے میں کوئی رقعہ لکھ دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا۔مولانا نے رقعہ لکھ دینے میں کافی مستعدی ظاہر کی اور دوسرے دن عصر کے بعد رقعہ لینے کے لیے بلایا۔میں ان کا شکریہ ادا کر کے رحمانیہ ہاسٹل اپنے دوستوں کے پاس لوٹ آیا۔

دوسرے دن عصر تک میرا کوئی کام نہیں تھا۔میں نے رحمانیہ کے دوستوں کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں داخلہ لینے آیا ہوں۔ظاہر ہے کہ اگر داخلہ کے لیے کوئی اقدام کیے بغیر یہاں سے مطلوبہ رقعہ لے کر روانہ ہو جاؤں تو یہاں کے احباب میرے بارے میں شکوک وشبہات میں پڑ جائیں گے کہ آخر یہ کیسا طالب علم ہے جو داخلہ کے لیے آیا اور مہتمم صاحب سے اس بارے میں کوئی بات کیے بغیر واپس چل دیا! چنانچہ میں نے صرف ان دوستوں کو مطمئن رکھنے کے لیے مصنوعی طور پر ایک درخواست لکھ کر مہتمم صاحب کو دے دی۔مجھے قوی امید تھی کہ اب داخلہ نہیں ہوگا اور اگر اتفاق سے ہو بھی جائے تو ان شاء اللہ پھر کوئی بہانہ بنا کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔مہتمم مدرسہ جناب مولانا نذیر احمد صاحب املوی (رحمہ اللہ) درخواست پر غور وخوض کرنے لگے۔درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ میں اس سے قبل مدرسہ فیض عام مئو میں فلاں جماعت تک تعلیم پا چکا ہوں۔مولانا موصوف کو اس کی تحقیق کرنی تھی اور میرے چال چلن کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔اتفاق سے اسی روز وہاں مدرسہ فیض عام مئو کے نائب صدر اپنے یا مدرسہ کے کسی کام کے لیے بنارس پہنچے ہوئے تھے۔مولانا کو تحقیق کے لیے بڑا اچھا موقع ہاتھ آیا جو میرے لیے بھی آسانی کا سبب بنا۔ظاہر ہے کہ مولانا نے ان سے میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ طلب کی ہوگی اور نائب صدر نے بھی ایسے موقع پر جبری تعلیم سے متعلق مقالہ

اور اس پر مدرسہ کی سی۔آئی۔ڈی کے سامنے جواب دہی کی ساری داستانیں سناڈالی ہوں گی، نیز یہ بھی بتادیا ہوگا کہ اس لڑکے نے عہد نامہ لکھ کر دیا ہے اور اس کا دوبارہ داخلہ منظور کیا جاچکا ہے،لیکن اس کے باوجود وہ یہاں بھاگ آیا۔

ظاہر ہے کہ ایسی باتیں سن کر مولانا مجھے مدرسہ میں داخل نہیں کر سکتے تھے اور ہوا بھی یہی، مولانا کی طرف سے مجھے جواب ملا کہ اب داخلہ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔اس وقت آپ کا داخلہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے یہ جواب سن کر اللہ کا شکرادا کیا،لیکن دوستوں کو اس کا افسوس ہوا اور کہنے لگے کہ پھر اب کہاں جانا ہے؟ میں نے کہا کوئی اور مدرسہ تلاش کروں گا، ویسے آپ لوگوں کو دو چار اچھے مدرسوں کے پتے معلوم ہوں تو مجھے لکھ کر دیجیے، ہوسکتا ہے کہ کسی میں داخلہ مل جائے۔انہوں نے کئی پتے لکھ دیے اور میں نے انہیں جیب میں رکھ دیا۔

شام کے وقت حسب وعدہ مولانا عبدالمجید صاحب حریری کے گھر پہنچا۔انہوں نے اپنے آفس جا کر خط مکمل کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے ہاسٹل واپس آیا اور بے چینی سے رات گزاری۔

صبح دس گیارہ بجے بنارس اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا۔ دوستوں نے چاہا کہ میرے ساتھ اسٹیشن تک جائیں، لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت آپ کا درس چل رہا ہے، ساتھ چلنے سے میرا بھی کوئی فائدہ نہیں اور بلاوجہ آپ لوگوں کا درس بھی ضائع ہوگا۔وہ میری بات مان گئے اور میں تنہا رکشا پر بیٹھ کر بنارس اسٹیشن پہنچا۔ دوستوں سے پیچھا چھڑانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مجھے بمبئی کی گاڑی پکڑنی تھی، اگر یہ لوگ ساتھ ہوتے تو مجھے مجبوراً دکھاوے کے لیے ان کے بتائے ہوئے مدارس کی طرف کم از کم ایک آدھ اسٹیشن تک پروگرام کے خلاف الٹا سفر کرنا پڑتا اور پھر وہاں اتر کر بمبئی کے لیے دوسری گاڑی کا انتظار کرنا پڑتا۔

بے پر اُڑنے کی کوشش

''پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے''

میں سیدھا بنارس اسٹیشن پہنچا۔ بمبئی والی گاڑی کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اب یہاں سے بمبئی پہنچنے کا مسئلہ سامنے تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس سفر کے شروع کرتے وقت میرے پاس صرف بارہ روپے تھے۔ پھر مئو سے بنارس، اور مدرسہ رحمانیہ سے اسٹیشن تک پہنچنے میں لگ بھگ چار پانچ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اب صرف سات یا ساڑھے سات روپے میرے پاس رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے میں بمبئی تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر بمبئی کیسے جایا جائے؟

مئو سے چلتے وقت ہی یہ طے کرلیا تھا کہ مجھے بنارس سے آگے جانے کے لیے بغیر ٹکٹ ہی گاڑی میں بیٹھنا پڑے گا، لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ مسئلہ بہر حال بہت پیچیدہ تھا۔ اچانک ایک پرانی ترکیب سوجھی اور خوش ہو گیا۔ ترکیب یہ تھی کہ گارڈ صاحب کے نام ہندی میں ایک درخواست لکھی جائے، اس میں اپنی حقیقت واصلیت ظاہر کرکے یہ استدعا کی جائے کہ وہ گاڑی میں فری بیٹھنے کی اجازت دیں۔ اگر انہوں نے منظور کرلی تو الحمد للہ، ورنہ اللہ پر بھروسہ کرکے چپکے سے کسی سیٹ پر جگہ سنبھال لوں گا، پہنچ گیا تو مقصد حاصل، اگر پکڑا گیا تو جیل یا جرمانہ۔ اس کے علاوہ قانونی طور پر اور کچھ نہیں ہونا ہے۔ ایسی صورت میں جرمانہ تو میں دینے سے رہا، البتہ اگر ایک دو ماہ کے لیے جیل ہو جائے تو یہ مجھے منظور ہے، جب چھوٹوں گا تو آگے کا سفر شروع کردوں گا۔ یہ سب سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو مضبوط بنایا اور مندرجہ ذیل قسم کی

ایک درخواست ہندی میں تیار کر لی۔

''محترم جناب گارڈ صاحب بمبئی میل

آداب!

بعدہ عرض ہے کہ میں ایک طالب علم ہوں۔ نام محمد عطاء الرحمن ہے۔ بہار ضلع پورنیہ کا رہنے والا ہوں۔ دینی ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کر چکا ہوں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی پہنچنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ پیسے ضرور ہیں لیکن وہ بمبئی تک کے کرایہ کے لیے ناکافی ہیں، اس لیے آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ مجھے گاڑی میں فری بیٹھنے کی اجازت دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ نہایت مہربانی ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ''

جب بمبئی والی گاڑی اسٹیشن پر پہنچ گئی تو میں گارڈ کی طرف بڑھا۔ جنکشن ہونے کی بنا پر یہاں گاڑی کافی دیر تک ٹھہرتی ہے۔ میں نے گارڈ صاحب کے پاس پہنچ کر آداب کہا اور لکھی ہوئی درخواست ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے اس پر سرسری نظر ڈال کر واپس کرتے ہوئے زبانی پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے مختصر الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔ میری بات سن کر انہوں نے جواب دیا کہ آپ اور دو تین گھنٹے بعد آنے والی دوسری گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ اس گاڑی میں کچھ آگے چل کر چیکنگ ہونے والی ہے۔ میں نے پھر سے کہا: جناب! اگر آپ مہربانی فرمائیں تو میں اسی گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کروں۔ میرے اصرار پر انہوں نے پھر کہا کہ اگر چیکنگ کے وقت پکڑے گئے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

اب گاڑی چھوٹنے ہی والی تھی۔ میں گارڈ کے پاس سے ہٹ گیا۔ مجھے گارڈ صاحب کی باتوں میں نرمی اور ہمدردی کا احساس ہوا، گویا انہیں اس حالت میں گاڑی پر بیٹھنے میں کوئی اعتراض نہیں، انہیں صرف جوڈیشل (مجسٹریٹ) چیکنگ کے وقت پکڑے جانے کا اندیشہ ہے۔

میں نے عزم کر لیا کہ اللہ پر بھروسہ کر کے اسی گاڑی سے جاؤں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو چیکنگ کے وقت بھی بچنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ گاڑی میں حرکت ہوتے ہی

میں نے قریب کے ایک ڈبہ میں داخل ہوکر سامان والی سیٹ پر اپنا بستر بچھا دیا اور چند منٹ بعد خود بھی اوپر جاکر اس بستر پر دراز ہوگیا۔ اب گاڑی اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند بھی آگئی۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے ایک چیکر نے دیگر مسافروں کے ٹکٹ دیکھتے ہوئے مجھے جگا کر ٹکٹ دیکھنا چاہا۔ میں سیٹ پر اُٹھ بیٹھا اور گارڈ صاحب کا واپس کردہ کاغذ اس چیکر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ میں گارڈ صاحب کو یہ دکھا کر اس گاڑی میں بیٹھا ہوں، امید ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ ہمدردی فرمائیں گے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن عنقریب جوڈیشئل (مجسٹریٹ) چیکنگ کا خطرہ ہے آپ آگے کے جنکشن تک ٹکٹ بنا لیجیے، پھر اس کے بعد کوئی خاص اندیشہ نہیں۔ میں نے ان کے مشورہ پر انہیں سے ڈھائی تین روپے کا ایک ٹکٹ بنوالیا اور کچھ دیر بعد مغرب وعشاء کی نماز ایک ساتھ پڑھ کر پھر اپنی سیٹ پر لمبا ہوگیا۔ جب تک جاگتا رہا کسی رسالہ کا مطالعہ جاری رکھا اور جب آنکھیں بھاری ہونے لگیں تو اچھی طرح سو گیا۔

صبح نیند ٹوٹی۔ نمازِ فجر ادا کر کے پھر لیٹ گیا۔ لگ بھگ آٹھ دس بجے ہماری گاڑی اٹارسی جنکشن میں رکی۔ یہاں ایک نیا چیکر آیا اور دیگر مسافروں کو چیک کرتے ہوئے میرے پاس پہنچا۔ میں نے کہا: بھئی! میرے پاس ٹکٹ تو نہیں، البتہ جس بنیاد پر میں گاڑی میں بیٹھا ہوں وہ دیکھ لیجیے۔ میں نے پھر وہی واپس کردہ درخواست اسے دکھائی، لیکن یہ چیکر ذرا سخت نکلا۔ اس نے کہا میں کچھ نہیں جانتا، آپ یا تو ٹکٹ دکھائیے یا گاڑی سے اتر جائیے۔ میں نے کہا: جناب! مجھے بمبئی جانا ہے۔ میں تو چوری چھپے گاڑی پر نہیں چڑھا؟ گارڈ صاحب کو کہہ کر چڑھا ہوں، لیکن چیکر صاحب میرا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔ وہ مجھے بار بار گاڑی سے اُتر جانے کے لیے کہتے جارہے تھے اور میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر انہوں نے ایک قلی بلاکر خود ہی میرا سامان اُٹھوا دیا۔ اب مجھے مجبوراً سامان کے ساتھ گاڑی سے اتر جانا پڑا۔ اس نے ریلوے پولیس کو کچھ کہہ کر مجھے مع سامان اس کے حوالہ کر دیا۔ اب سمجھا کہ میں صرف اتارا ہی نہیں گیا بلکہ پکڑا بھی گیا۔

اپنی زندگی میں پہلی نظر بندی

پولیس نے مجھے اسٹیشن سے متصل ایک کمرے کے قریب لے جا کر وہاں کے انچارج کے سپرد کر دیا۔ انچارج نے میرا پتہ وغیرہ لکھ لیا اور مجھے تنہا ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ پھر کچھ کھانے کے لیے نکالا۔ انچارج صاحب برتاؤ اور بات چیت سے نرم دل محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں کچھ ہمدردی ڈال دی تھی۔ وہ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے اور پوچھنے لگے کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں اور کس لیے جانا چاہتے ہیں؟ میں نے ان کو پوری حقیقت بتا دی۔ میری ہیئت اور وضع قطع سے ہی وہ محسوس کر چکے تھے کہ یہ لڑکا کوئی غلط نہیں ہے، اپنے بیان کے مطابق طالب علم ہی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مزید تصدیق واطمینان کے لیے میرا سامان کھلوایا اور اندر کی چیزیں دیکھنی شروع کر دیں۔ کچھ کھانے اور پہننے کے سامان کے ساتھ مختلف قسم کی کتابیں، ڈکشنری، ایٹلس اور کئی ایک کاپیاں نظر آئیں، جن سے ان کو یقین ہو گیا کہ میں واقعی طالب علم ہوں۔

اب انہوں نے مجھ سے مزید ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے دوبارہ مجھے کمرے میں بند نہیں کیا، کہنے لگے اگر آپ چار ساڑھے چار روپے خرچ کر سکیں تو میں آپ کو یہاں سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کروں۔ میں نے کہا: بھئی! اگر میرے پاس کافی پیسے ہوتے تو میں بے ٹکٹ سفر ہی کیوں کرتا۔ میرے پاس تھوڑا سا پیسہ ہے جس کی بمبئی اترنے کے بعد رکشا تانگا کے کرایہ کے لیے ضرورت پڑے گی۔ انہوں نے پھر کہا کہ آپ جتنا دے سکتے ہیں دے دیجیے، بقیہ کا میں خود انتظام کرتا ہوں۔ میں نے کہا دو ڈھائی روپے دے سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا:

آپ کسی طرح تین روپے دے دیجیے، تاکہ ڈیڑھ روپیہ میں اپنی طرف سے ڈال کر آپ کے نام رسید بنادوں اور آپ کو یہاں سے چھٹی کردوں۔ آٹھ نو بجے رات کی گاڑی میں آپ بیٹھ سکتے ہیں۔ آگے کوئی خاص چیکنگ نہیں ہوتی۔

میں نے انہیں تین روپے دے دیے۔ انہوں نے مزید ایک ڈیڑھ روپیہ ڈال کر رسید بنائی اور میری نظر بندی کا قصہ ختم کردیا۔ جب گاڑی پہنچی تو میرا سامان گاڑی تک پہنچانے کے لیے اپنے ایک آدمی کو بھی ساتھ کردیا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرکے گاڑی کی جانب بڑھا۔ ایک مناسب ڈبہ میں اوپر کی سیٹ پر پھر سے بستر بچھادیا اور ساتھ آئے ہوئے آدمی کو آداب کہہ کر واپس کردیا۔

بمبئی اسٹیشن گیٹ پر

کرشمہ خداوندی کا نظارہ

اب اٹارسی جنکشن چھوڑنے کے لیے گاڑی حرکت میں آچکی تھی۔ نمازِ عشاء پڑھ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی بمبئی کے علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد نیچے کی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اب یہ فکر لاحق تھی کہ گیٹ سے نکلنے کے لیے کیا ترکیب اختیار کی جائے۔ کوئی بھی آسان صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بمبئی میرے لیے ایک نئی جگہ تھی۔ کسی گلی کوچے سے چھپ کر نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اللہ پر بھروسہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے خصوصی مہربانی کی تو یہاں سے نکل سکتا ہوں ورنہ پکڑا جانا لازمی ہے، لیکن پکڑے جانے سے بھی میں نہیں ڈرتا، البتہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں تاخیر ہو سکتی ہے۔

اپنے آپ یہ بھی طے کیا کہ گاڑی رکتے ہی سامان کسی قلی کو دے دوں گا اور معمولی کوئی چیز اپنے ہاتھ میں لے کر پُروقار انداز سے آگے بڑھتا رہوں گا۔ اگر خدا کی مہربانی سے نکل گیا تو الحمدللہ، اور اگر کسی نے ٹوکا تو پھر حالات کے پیشِ نظر جو ہوگا اس سے نمٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان باتوں کے تصور سے دل بہت مطمئن ہو گیا اور خوف وہراس کے سارے آثار جاتے رہے۔

کچھ دیر بعد بمبئی کے آخری اسٹیشن بوری بندر پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ مسافر اترنے لگے۔ میں نے حسبِ پروگرام ایک قلی بلایا۔ سامان اس کے حوالے کر دیا اور خود ایک ہاتھ میں ٹفن

کیریر اور دوسرے ہاتھ میں ایک پنکھا سنبھالتا ہوا قلی کے پیچھے پورے وقار سے چلنے لگا۔ دل میں اللہ کی یاد جاری تھی۔ گیٹ کی طرف کچھ دور ہی سے سرسری نظر دوڑائی۔ گیٹ کے دونوں طرف ٹکٹ کلکٹر کھڑے ہو کر نکلنے والے مسافروں سے ٹکٹ لے رہے تھے۔ قلی آگے چل رہا تھا۔ میں ٹکٹ کلکٹر کی طرف کوئی دھیان دیے بغیر قدرے شانِ بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور عزم کر لیا کہ جب تک کوئی نہیں روکتا پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نہایت آسانی سے نکل گیا۔ روکنا تو درکنار کسی نے مجھے ٹوکا تک نہیں۔ اسٹیشن سے باہر ٹیکسی کے قریب پہنچ کر مزید اطمینان کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ میرا کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا، لیکن خدا کے فضل سے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اب اللہ کا شکر دل کے ساتھ زبان سے بھی جاری ہونے لگا۔ خوشی کے مارے جی چاہا کہ سجدہ شکر بھی ادا کرلوں، لیکن وہاں کے ظروف کے پیش نظر ایسا نہیں کرسکتا تھا۔

اب قلی کو ایک ٹیکسی میں سامان رکھنے کے لیے کہا اور اجرت دے کر اسے رخصت کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ صابو صدیق مسافر خانہ چلے جہاں حاجی لوگ ٹھہرتے ہیں۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی روڈ پر دوڑنے لگی اور دس پندرہ منٹ میں مسافر خانہ پہنچ گئی۔ مسافر خانہ کے گیٹ پر اتر کر میں نے ڈرائیور کو ایک روپیہ کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ باقی واپس کیجیے۔ میٹر دیکھ کر اس نے اپنا پیسہ لے لیا اور مجھے چار یا چھ آنے واپس کر دیے۔

مجھے حاجی سمجھ کر مسافر خانہ کے خادم نے میرا سامان لے کر دفتر کے پاس رکھا اور مجھے اپنا نام و پتہ رجسٹر میں درج کروانے کو کہا۔ میں اس شغل سے فارغ ہوا تو پھر وہ خادم میرا سامان وہاں سے اُٹھا کر اوپری منزل کی طرف چل پڑا اور تیسری منزل پر جا کر دیگر حاجیوں کے قریب ایک مناسب جگہ پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ دوسرے حاجیوں کی طرح میں نے بھی وہاں اپنا بستر بچھا دیا اور چند منٹ بیٹھنے کے بعد غسل خانہ جا کر ہاتھ منہ دھو آیا۔

اب میرے پاس صرف ڈیڑھ روپیہ باقی رہ گیا تھا اور میں اسے بہت حفاظت سے بچائے رکھنا چاہتا تھا، تاکہ کسی آڑے وقت کام آئے۔ میرے سامان میں اب بھی کھانے کی

کچھ چیزیں موجود تھیں۔ چار پانچ سیر چاول میں سے اب تک کچھ بھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ کچھ چوڑا ابھی تھا جس میں سے تھوڑا نکال کر ناشتہ کیا اور ہوٹل جا کر چائے پی لی۔

سمندر پار کرنے کی کوشش

اور احتیاطی تدابیر

اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ سمندر پار کرنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ خیال آیا کہ مئو سے چلتے وقت اس سلسلے میں جو بات ذہن میں آئی تھی پہلے اسی کا تجربہ کرلیا جائے۔ اپنے اطراف کے لیے کام کرنے والے معلم سید ابراہیم مجبوب کا نام یاد تھا۔ چنانچہ اس نام کے معلم کے بارے میں مسافر خانہ کے خادموں اور دفتر کے لوگوں سے دریافت کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح جب وہ معلم مسافر خانہ پہنچے تو بعض خادموں نے کہا کہ یہی وہ صاحب ہیں۔ میں نے ان کو سلام و مصافحہ کے بعد اپنا مختصر تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے حاجی سمجھ کر نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ میں نے کہا کہ آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں، اگر کچھ موقع دیں تو تفصیل سے گفتگو کروں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔

معلم صاحب مجھے ساتھ لے کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں پہنچ کر ہم کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بیرے کو ناشتہ لانے کا آرڈر دیا۔ وہ حکم کی تعمیل کے لیے فوراً چل دیا اور اِدھر ہماری گفتگو بھی شروع ہوگئی۔ میں نے کہا کہ آپ ہمارے ضلع پورنیہ کے معلم ہیں۔ آپ کی معلمی میں میرے والد اور دادا صاحبان حج کر چکے ہیں اور اسی بنا پر گویا ہمارے اور آپ کے درمیان ایک خاص تعلق موجود ہے۔ میں کل بمبئی پہنچا ہوں۔ میں ایک طالب علم

ہوں اور علم حاصل کرنے کی غرض سے سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔ جہاز کے کرایہ کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں بمشکل یہاں تک پہنچا ہوں اور اس وقت سوائے ایک ڈیڑھ روپیہ کے میرے پاس اخراجات کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ اگر آپ مہربانی فرمائیں اور اپنے ساتھ کسی طرح مجھے مکہ مکرمہ تک پہنچا دیں تو میں تاحیات آپ کا شکرگزار رہوں گا۔

معلم صاحب میرے بارے میں غالباً یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ایک بڑا آسامی ہاتھ آ گیا ہے، ممکن ہے میرے ذریعہ انہیں اور بہت سارے حجاج ملیں گے جن سے ان کو مالی فائدہ ہوگا۔ لیکن جب میں نے ان کے سامنے حقیقت بیان کر دی تو گویا ان کے لیے "سمجھا ہاتھی نکلا چوہا" والی بات ہوگئی۔ وہ کہنے لگے: بھئی! میں آپ کے ساتھ جو کچھ کر سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ حاجیوں سے جو معلمی فیس لیتا ہوں وہ آپ سے نہیں لوں گا۔ حاجی لوگوں کو مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کے لیے گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے میں یہ کرایہ بھی آپ کو معاف کر دوں گا۔ یہ چیزیں میرے ہاتھ میں ہیں، اس لیے میں انہیں معاف کر سکتا ہوں۔ لیکن جو چیزیں میرے ہاتھ میں نہیں ہیں ان کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کم از کم پانچ چھ سو روپے خرچ کر کے بحری جہاز کا ٹکٹ لے سکیں تو آپ کو میری طرف سے مذکورہ تعاون مل سکتا ہے۔

اب معلم صاحب کو مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال آیا۔ انہوں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے یہ نوٹ معلم صاحب کو واپس کرتے ہوئے کہا کہ معلم صاحب! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ سے پرائیویٹ بات کر کے کچھ پیسے حاصل کرلوں۔ میں تو آپ سے سمندر پار کرا دینے کی توقع کر رہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: اسے رکھ لیجیے کام آئے گا، پھر زبردستی جیب میں ڈال دیا۔ اب میں نے دوبارہ واپس کرنے کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ میرے پاس بھی تو پیسے ختم ہی ہو رہے تھے۔

معلم صاحب کو میں ایک بڑا آدمی سمجھ رہا تھا۔ اگر اجر وثواب کے خیال سے نہیں تو کم از کم اپنے وقار اور وسعت ظرفی کے اظہار کے طور پر ہی وہ میری درخواست منظور کر لیتے تو بھی کر سکتے تھے، لیکن وہ اس کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ایک ایسے معلم کے لیے جو صرف ایک موسم

حج میں لاکھوں کما لیتا ہو، پانچ چھ سو روپے خرچ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن ایسا بننے کے لیے دل میں وسعت ہونی چاہیے جبھی ہاتھ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال، افسوس کرتا ہوا میں معلم صاحب سے جدا ہوا اور دوبارہ پھر کبھی ان سے کوئی چیز طلب نہیں کی، بلکہ دل میں یہ عزم کرلیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کبھی موقع دیا تو انہیں یہ پانچ روپے کسی نہ کسی صورت سے لوٹا دوں گا، تا کہ وہ بعد میں مجھ پر اپنے ان پانچ روپیوں کا احسان نہ جتا سکیں۔ چنانچہ ایک روز ایسا موقع ہاتھ آ ہی گیا۔ جب میں اللہ کے فضل وکرم سے مکہ مکرمہ پہنچ گیا اور معلم صاحب مذکور نے مجھ سے ایک بار کچھ دوا خرید لانے کی فرمائش کی، جس کی قیمت پانچ روپے سے ڈیڑھ دوگنا زیادہ ہی رہی ہوگی، تو میں نے دوا خرید کر انہیں پہنچا دی۔ اس پر وہ مجھے دوا کی قیمت دینے لگے تو میں نے ''تلک بتلک'' کہہ کر قیمت لینے سے انکار کر دیا اور اس طرح میں نے اس کے احسان جتانے کا امکانی راستہ بند کر دیا۔

معلم کے بارے میں مئو سے جو امید لے کر چلا تھا اب وہ امید ناامیدی میں بدل گئی۔ اب مجھے کوئی اور تدبیر سوچنی تھی۔ میں نے بنارس سے چلتے وقت کرایہ فری کرانے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اب خیال آیا کہ اسے جہاز کمپنی پر بھی آزما کر دیکھوں، چنانچہ جہاز کمپنی مغل لائن لمیٹیڈ کو ایک خط لکھا۔ اپنا تعارف و مقصد واضح کرتے ہوئے اس سے درخواست کیا کہ:

''اگر آپ مجھے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے جدہ تک فری لے جا سکتے ہیں تو براہِ کرم مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو جس طرح ریلوے ڈپارٹمنٹ طالب علم کے لیے پچاس فیصد کنسیشن دیتا ہے کیا آپ بھی اس طرح کی کنسیشن پر ٹکٹ دے سکتے ہیں؟ امید ہے کہ فوری جواب سے شاد فرمائیں گے۔''

جہاز کمپنی کو خط لکھنے کے بعد ایک تفصیلی خط اپنے گھر والد صاحب کے نام بھی لکھ دیا کہ:

''میں بقیہ تعلیم سعودی عرب جا کر پوری کرنا چاہتا ہوں۔ بروقت مدرسہ سے بمبئی آ گیا ہوں۔ یہاں سے آگے کے لیے مجھے سات آٹھ سو روپے کی ضرورت ہے، برائے مہربانی آپ اور چچا لوگ مل کر مذکورہ مبلغ جس قدر جلد ہو سکے میرے نام بمبئی روانہ فرمائیں، عین نوازش

ہوگی۔''

ایک تیسرا خط مدرسہ فیض عام مئو میں اپنے ماموں زاد بھائی جناب مولوی افسرالدین صاحب کے نام بھی لکھ دیا کہ:

''میں اب بقیہ تعلیم کی تکمیل سعودی عرب میں کرنا چاہتا ہوں۔ بروقت بمبئی پہنچ چکا ہوں اور آگے کے لیے کوشش جاری ہے۔ میں ایک ڈبہ گھی مدرسہ میں بھول آیا ہوں۔ برائے مہربانی آپ اسے بیچ کر جو بھی پیسے ملیں میرے نام بمبئی روانہ کردیں تاکہ میں اس سے کچھ کام لے سکوں۔''

ان تینوں خطوط کے روانہ کردینے کے بعد بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جہاز کمپنی کا جواب سب سے پہلے پانے کی توقع کررہا تھا، کیوں کہ یہ بمبئی ہی کی بات تھی، لیکن پانچ چھ روز گزرجانے کے باوجود کمپنی سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چنانچہ پھر ایک خط لکھ کر کمپنی کے نام روانہ کردیا۔

بارہ تیرہ روز کے بعد مدرسہ فیض عام مئو کے خط کا جواب منی آرڈر کی صورت میں پہنچ گیا۔ دس بجے کے قریب مسافر خانہ کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آرہی تھی کہ محمد عطاء الرحمن صاحب پورنیوی! آپ کے نام منی آرڈر آیا ہوا ہے۔ آپ دفتر آکر اپنا پیسہ وصول کرلیں۔

میں آواز سن کر دل میں یہ سوچتا ہوا دوڑا کہ شاید والد صاحب کی طرف سے سات آٹھ سو روپیہ آیا ہوگا۔ اگر ایسی بات ہے تو اب ماشاء اللہ بیڑا پار ہوجائے گا اور اگر مدرسہ کی طرف سے آیا ہوا ہے تو سات آٹھ روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔ دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بائیس روپے کا منی آرڈر مدرسہ فیض عام مئو سے میرے ماموں زاد بھائی نے بھیجا ہے۔ ان کی طرف سے توقع سے زیادہ روپیہ آنے پر مجھے خوشی ہوئی اور ساتھ ہی تعجب بھی۔ کیوں کہ وہ کوئی مالدار آدمی نہیں تھے، پھر انہوں نے اتنا پیسہ کیسے بھیج دیا!! لیکن جب منی آرڈر فارم کے کوپن پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ میرا خط مدرسہ پہنچتے ہی احباب میں میرے بمبئی پہنچنے کی خبر پھیل گئی تھی اور جب بھائی افسرالدین صاحب نے میرے لیے میری فرمائش کے مطابق

پیسے بھیجنے کا پروگرام بنایا تو دیگر احباب نے بھی اپنی جانب سے تھوڑا تھوڑا پیسہ جمع کر دیا اور اس طرح بائیس روپے بن گئے۔

میں پیسہ وصول کر کے اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اب تک کمپنی کے نام لکھے ہوئے دوسرے خط کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ مزید دو تین دن انتظار کرنے کے بعد مایوسی ہونے لگی اور افسوس بھی ہوا کہ کمپنی نے خط کا ''ہاں یا ناں'' کوئی بھی جواب نہیں دیا۔

اب دماغ میں کچھ اس قسم کی باتیں آنے لگیں کہ اگر کمپنی کو میری درخواست منظور نہیں تو کم از کم اتنا لکھ کر مطلع کر دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا کہ درخواست میں جو مانگ کی گئی ہے کمپنی کے پاس اس کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن اس نے کسی قسم کا کوئی جواب دینا ہی گوارا نہیں کیا، گویا میرے خطوط ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کے قابل سمجھ لیے گئے۔ ٹھیک ہے، اگرچہ کمپنی نے میرے سلسلے میں خاموشی اختیار کر لی ہے، لیکن میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ان شاء اللہ کسی نہ کسی طرح بغیر ٹکٹ ہی اس کے جہاز میں بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔ اس طرح اگر سمندر پار ہو گیا تو الحمدللہ، بصورتِ دیگر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

بحری جہاز میں
نوکری حاصل کرنے کی کوشش

قبل اس کے کہ جہاز میں بغیر ٹکٹ بیٹھنے کی کوشش کی جائے، ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ اگر قبل از وقت کوشش کر کے جدہ جانے والے جہاز میں کوئی نوکری مل جائے تو نہایت آسانی واطمینان سے جدہ پہنچا جا سکتا ہے، پھر کیوں نہ اس کے لیے کچھ دوڑ دھوپ کر لی جائے؟ اب کیا تھا، اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدو جہد شروع کر دی۔

حاجیوں سے متعلق بمبئی جدہ سفر کرنے والے بحری جہازوں کے ٹائم ٹیبل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کل پرسوں محمدی جہاز روانہ ہونے والا ہے اور اس کے دو تین روز بعد سعودی جہاز روانہ ہوگا۔ محمدی جہاز کے روانہ ہوتے وقت میں بھی بندرگاہ پہنچا اور حاجیوں کے جہاز پر سوار ہونے اور بندرگاہ سے اس جہاز کے روانہ ہونے کا منظر دیکھ آیا۔ یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سارے لوگ حاجیوں کو سیٹ پر بیٹھانے کے بعد جہاز کی روانگی سے کچھ پہلے اتر آئے۔ اس مشاہدہ سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ رخصت کرنے والوں کو بھی جہاز کے اوپر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔

محمدی جہاز کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے یہ عزم کر لیا کہ ان شاء اللہ العزیز، اس کے بعد جانے والے سعودی جہاز پر کسی نہ کسی طرح چڑھنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے تو سابق پروگرام کے مطابق اس میں نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ روانگی سے دو روز قبل پھر بندرگاہ پہنچا۔ وہاں کام کرنے والوں سے دریافت کیا کہ سعودی جہاز جو کل

پرسوں حاجیوں کو لے کر روانہ ہونے والا ہے، کہاں ہے اور کس وقت یہاں آئے گا؟ انہوں نے کہا کہ اس وقت وہ فلاں نمبر بندرگاہ میں سامان لا د رہا ہے اور سامان سے فارغ ہونے کے بعد وہ یہاں آجائے گا۔

میں دریافت کرتا ہوا بندرگاہ کے اس نمبر تک پہنچ گیا جہاں سعودی جہاز پر سامان لادا جا رہا تھا۔ میں نے جہاز کے اوپر جانے کی کوشش کی۔ سیڑھی کے پاس جہاز کے جو لوگ موجود تھے ان سے کہا کہ کیا میں اوپر آسکتا ہوں؟ انہوں نے پوچھا کس لیے آنا چاہتے ہو؟ جواب دیا: بس یوں ہی تفریح کے لیے، بہت دنوں سے جہاز کے اندر کل پرزے دیکھنے کا شوق تھا اور اتنا بڑا جہاز کبھی دیکھا بھی نہیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے، آیئے کوئی حرج نہیں۔ میں بسم اللہ کہہ کر جہاز پر چڑھ گیا۔ اِدھر اُدھر گھوم گھام کر دیکھا۔ اندر گھسا اور دائیں بائیں معائنہ کرتا ہوا جہاز کے مطبخ کے پاس پہنچا جہاں کھانا پکانے والے چند آدمی اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان لوگوں سے دریافت کیا کہ بھئی! آپ لوگ یہاں جو کام کر رہے ہیں اگر اس میں مزید آدمی کی ضرورت ہو تو براہِ کرم مجھے بتایئے، میں اس جہاز میں کسی بھی قسم کی کوئی نوکری حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

ان میں سے ایک آدمی نے کہا بھئی، جہاز میں کوئی نوکری اس طرح جہاز پر آکر کسی کو کہنے سے نہیں ملتی۔ جہاز میں ملازم کی ضرورت ہونے پر جہاز انچارج اپنی کمپنی کو رپورٹ دیتا ہے کہ ہمیں فلاں کام کے لیے ملازم چاہیے اور کمپنی کے آفس کی طرف سے ملازم متعین کر کے جہاز میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاز میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کمپنی کی آفس میں درخواست دی جاتی ہے۔

ان باتوں سے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں جس قسم کی نوکری فوری طور پر حاصل کرنا چاہتا ہوں یہاں ایسی نوکری اتنی جلدی نہیں مل سکتی۔ غالباً یہ لوگ میری اس بات سے کہ ''میں اس جہاز میں کسی بھی قسم کی نوکری حاصل کرنا چاہتا ہوں'' میرا مقصد کسی قدر بھانپ گئے، چنانچہ انہوں نے مزید سوال کیا کہ بھئی! آپ اس جہاز میں کسی بھی قسم کی نوکری چاہتے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟ آپ کھل کر بتائیں، اگر ہمیں اس سلسلے میں کوئی علم ہو تو ہم آپ کو بتانے کی

کوشش کریں گے۔ میں نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس کرایہ کے لیے پیسہ نہیں ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جہاز میں آپ لوگوں کے ساتھ نوکر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے جدہ پہنچ جاؤں اور وہاں کسی طرح اتر کر اپنے مقصد کے لیے چل دوں۔

انہوں نے میرا اصل مقصد معلوم کر کے نہایت ہمدردانہ انداز میں بتایا کہ بھائی صاحب! آپ سٹی آفس میں جا کر کوشش کیجیے۔ ممکن ہے کوئی کام مل جائے اور اس طرح آپ جدہ پہنچ جائیں۔ میں نے ان سے مزید کہا کہ فرض کیجیے کہ میں نے آفس میں درخواست دے دی، لیکن اس کے باوجود مجھے بروقت جہاز میں نوکری نہیں ملی، پھر میں کسی طرح کوشش کر کے بغیر ٹکٹ ہی جہاز میں بیٹھ گیا تو کیا ایسی صورت میں جدہ پہنچنا ممکن ہے؟ کیا راستے میں جہاز کے اندر کوئی چیکنگ بھی ہوتی ہے؟

انہوں نے کہا کہ اس طرح تو بعض لوگ اس سے قبل بھی جدہ پہنچ گئے، لیکن جدہ بندرگاہ میں اترتے وقت پکڑ لیے گئے اور انہیں بمبئی واپس کر دیا گیا۔ راستے میں کوئی چیکنگ نہیں ہوتی، اس لیے جدہ تک پہنچنا تو ممکن ہے لیکن وہاں اترنا ہی بہت مشکل ہے۔

اتنا معلوم کرنے کے بعد ان لوگوں کے پاس مزید ٹھہرنا یا مزید گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں سلام کر کے جہاز سے اتر کر سیدھا صابو صدیق مسافر خانہ واپس آ گیا۔

بلا ٹکٹ و بلا پاسپورٹ

سمندری دس روزہ سفر

اب سوچنے لگا کہ جہاز کی روانگی کے دن اس جہاز پر کس طرح چڑھا جائے، نیز اگر کسی طرح حاجیوں کے ساتھ جہاز پر چڑھ بھی گیا تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ میں جدہ میں اتر بھی سکوں۔ اگر خدانخواستہ جہاز والوں نے مجھے بمبئی واپس کر دیا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اس مسئلہ میں مشورہ کرنے کے لیے سوچا کہ کیوں نہ مولانا محمد داؤد راز صاحب سے ملاقات کر لی جائے۔ وہ ان دنوں مؤمن پورہ بمبئی کی مسجد اہل حدیث کے خطیب و امام تھے۔ میں ٹیکسی کر کے مؤمن پورہ گیا اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے اہل حدیث مسجد پہنچ گیا۔

حسن اتفاق سے مولانا صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا کہ مولانا صاحب! میں ان طلباء میں سے ایک ہوں جن کے سالانہ امتحان لینے کے لیے آپ مدرسہ فیض عام مئو بلائے گئے تھے۔ اب میں نے مدرسہ فیض عام چھوڑ دیا ہے اور اس خیال سے یہاں آ گیا ہوں کہ بقیہ تعلیم سعودی عرب جا کر پوری کروں۔ میرے پاس وہاں تک پہنچنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ اپنے اطراف کے معلم کے توسط سے سمندر پار کر لوں گا، لیکن معلم صاحب نے مجھے ٹرخا دیا۔ اب بھی مختلف کوششیں جاری رکھے ہوئے ہوں، لیکن یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ میں وہاں جا بھی سکوں گا یا نہیں؟

اگر خدانخواستہ میں سعودی عرب نہیں جا سکا تو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کیا کروں؟ کیا آپ مجھے بمبئی میں اس کے قرب وجوار کے کسی اچھے مدرسہ کا پتہ بتا سکتے ہیں جہاں میں

اطمینان سے تعلیم حاصل کرسکوں؟ نیز کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے اس مدرسہ کے نام ایک خط بھی لکھ دیں تا کہ وہاں پہنچنے کے بعد آسانی سے داخلہ اور طعام وقیام کا انتظام ہو جائے؟

مولانا صاحب نہایت شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ قریب ہی مالیگاؤں میں ایک اچھا مدرسہ ہے جہاں آپ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ وہاں مدرسہ کی طرف سے طعام وقیام کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر مولانا نے مدرسہ کے ناظم کے نام ایک خط لکھ دیا۔ میں نے وہ خط لے لیا اور مولانا صاحب کو سلام کر کے مسافر خانہ واپس آ گیا۔

مسافر خانہ میں اب تک حاجیوں کے جس قافلہ کے قریب رہا ان سے اچھی خاصی انسیت و دوستی ہو چکی تھی۔ یہ لوگ ضلع مغربی دیناج پور کے رہنے والے تھے۔

قافلہ کے سردار حاجی ماسٹر تمیز الدین صاحب تھے اور یہ پہلے بھی حج کر چکے تھے۔ ماسٹر جی کے کہنے سے میں قافلے کے ان پڑھ حاجیوں کو حج ونماز سے متعلق ضروری طریقہ ودعا سکھاتا رہا۔ ان میں سے ایک شخص کے بیٹے کا نام عطاء الرحمن تھا، اس لیے انہوں نے مجھے اپنا دوست بیٹا بنالیا۔ کھانے کے سلسلے میں کئی روز تو اپنے پاس کا روکھا سوکھا چوڑا کھا کر گزارا کرتا رہا، لیکن ان لوگوں سے تعارف ہو جانے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھانے کے لیے مجبور کر دیا۔ انہوں نے یومیہ دو وقت کا کھانا پکانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ کھانا شروع کرتے ہی میں نے اپنا چاول ان کے حوالے کر دیا۔ جس روز میرا والا چاول پکا تو انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی کہ یہ بہت ہی ذائقہ دار چاول ہے۔

ان حاجیوں میں صرف ماسٹر جی ہی ایسے شخص تھے جن کو میں نے رازدارانہ طور پر اپنا مقصد بتایا تھا۔ باقی لوگ مجھے حاجی سمجھے ہوئے تھے۔ ماسٹر جی کو میں نے آخری پروگرام بھی بتا دیا کہ اب میں کسی نہ کسی طرح حاجیوں کے ساتھ سعودی جہاز پر چڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جہاز پر چڑھ جانے کے بعد کوئی چیکنگ نہیں ہوتی، لہٰذا جدہ تک پہنچنے کا امکان نظر آ رہا ہے۔ البتہ جدہ میں اترنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، لیکن میں اللہ پر بھروسہ کر کے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ وہاں جیسا موقع ہوگا دیکھوں گا اور ان شاء اللہ اس کے مطابق اپنے مقصد کی

کامیابی کے لیے کوشش کروں گا۔

ماسٹر جی نے میری ان باتوں کو غور سے سنا اور سوچنے لگے کہ اس سلسلہ میں کیا کرنا مناسب ہے۔ میں نے ان سے مزید کہا کہ محمدی جہاز کی روانگی کے وقت میں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ حاجیوں کو چڑھانے اور رخصت کرنے کے لیے جہاز پر گئے ہوئے تھے اور جب جہاز کھلنے کا وقت ہوا تو وہ اُتر آئے۔ اگر انہیں لوگوں کی طرح میں بھی حاجیوں کو رخصت کرنے کے نام سے جہاز پر چڑھ سکوں تو میرا مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی ایک جگہ حاجی کی طرح بستر لگا کر بیٹھ جاؤں گا اور کسی کو کچھ شبہ تک نہیں ہوگا۔

ماسٹر جی نے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے سابق معروف مخلص قلی کو بلایا۔ اسے رازدارانہ طور پر میرا مقصد بتا کر کہا: حاجیوں کو رخصت کرنے کے لیے جہاز کے اندر جانے کی کیا صورت ہے؟ قلی نے کہا کہ اس کے لیے پاس بنوانا پڑتا ہے، لیکن یہ سب کو نہیں ملتا، صرف خاص خاص لوگوں کو ملتا ہے، تاہم قلی نے وعدہ کیا کہ وہ اس قسم کا پاس حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔

قلی نے کچھ تگ ودو کر کے کہیں سے ایک ایسا پاس حاصل کر لیا جس میں کسی اور شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے سیاہی مٹانے والی دوا کے ذریعہ وہ نام مٹا کر مجھ سے کہا کہ اس جگہ اپنا نام لکھ دو، یہ پاس سنبھال کر رکھو اور کل کے جہاز پر جانے کے لیے تیار رہو۔

قلی بہرحال قلی ہے، وہ کسی کے لیے کوئی کام کرنے کے بعد کچھ بخشش پانے کی بھی امید رکھتا ہے۔ ہمارے اس محسن قلی نے بھی اپنی بخشش کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے ماسٹر جی سے مشورہ کیا کہ اسے کیا دیا جائے؟ ماسٹر جی نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اس اہم کام پر اسے کچھ نہ کچھ دیا جانا چاہیے، لیکن انہوں نے قلی سے مشورہ کیا تو قلی نے پچاس روپے کا مطالبہ کیا۔ ماسٹر جی کو اب تک پتہ نہ تھا کہ میرے پاس کتنا پیسہ ہے۔ قلی کا مطالبہ سن کر میں نے ماسٹر جی سے کھل کر کہہ دیا کہ میرے پاس صرف بیس بائیس روپے موجود ہیں، ان میں سے آپ جتنا مناسب سمجھیں اسے دے سکتے ہیں۔ ماسٹر جی کو جب میری مالی حالت کا علم ہوگیا تو فرمایا کہ آپ خود

کامیابی کے لیے کوشش کروں گا۔

ماسٹر جی نے میری ان باتوں کو غور سے سنا اور سوچنے لگے کہ اس سلسلہ میں کیا کرنا مناسب ہے۔ میں نے ان سے مزید کہا کہ محمدی جہاز کی روانگی کے وقت میں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ حاجیوں کو چڑھانے اور رخصت کرنے کے لیے جہاز پر گئے ہوئے تھے اور جب جہاز کھلنے کا وقت ہوا تو وہ اُتر آئے۔ اگر انہیں لوگوں کی طرح میں بھی حاجیوں کو رخصت کرنے کے نام سے جہاز پر چڑھ سکوں تو میرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی ایک جگہ حاجی کی طرح بستر لگا کر بیٹھ جاؤں گا اور کسی کو کچھ شبہ تک نہیں ہوگا۔

ماسٹر جی نے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے سابق معروف مخلص قلی کو بلایا۔ اسے رازدارانہ طور پر میرا مقصد بتا کر کہا: حاجیوں کو رخصت کرنے کے لیے جہاز کے اندر جانے کی کیا صورت ہے؟ قلی نے کہا کہ اس کے لیے پاس بنوانا پڑتا ہے، لیکن یہ سب کو نہیں ملتا، صرف خاص خاص لوگوں کو ملتا ہے، تاہم قلی نے وعدہ کیا کہ وہ اس قسم کا پاس حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔

قلی نے کچھ تگ ودو کر کے کہیں سے ایک ایسا پاس حاصل کر لیا جس میں کسی اور شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے سیاہی مٹانے والی دوا کے ذریعہ وہ نام مٹا کر مجھ سے کہا کہ اس جگہ اپنا نام لکھ دو، یہ پاس سنبھال کر رکھو اور کل کے جہاز پر جانے کے لیے تیار رہو۔

قلی بہر حال قلی ہے، وہ کسی کے لیے کوئی کام کرنے کے بعد کچھ بخشش پانے کی بھی امید رکھتا ہے۔ ہمارے اس محسن قلی نے بھی اپنی بخشش کے لیے اشارہ کیا۔ میں نے ماسٹر جی سے مشورہ کیا کہ اسے کیا دیا جائے؟ ماسٹر جی نے اپنی رائے ظاہر کی کہ اس اہم کام پر اسے کچھ نہ کچھ دیا جانا چاہیے، لیکن انہوں نے قلی سے مشورہ کیا تو قلی نے پچاس روپے کا مطالبہ کیا۔ ماسٹر جی کو اب تک پتہ نہ تھا کہ میرے پاس کتنا پیسہ ہے۔ قلی کا مطالبہ سن کر میں نے ماسٹر جی سے کھل کر کہہ دیا کہ میرے پاس صرف بیس بائیس روپے موجود ہیں، ان میں سے آپ جتنا مناسب سمجھیں اسے دے سکتے ہیں۔ ماسٹر جی کو جب میری مالی حالت کا علم ہو گیا تو فرمایا کہ آپ خود

ہی جو مناسب سمجھیں میرے ہاتھ میں دے دیجیے، اس میں مَیں کچھ اپنی طرف سے ملا کر قلی کو خوش کر دوں گا۔ میں نے ماسٹر جی کا شکریہ ادا کیا اور چودہ روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیے پھر بعد میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا کر قلی کو خوش کر دیا۔

قلی کے کہنے کے مطابق کل کے جہاز میں سفر کرنے کے لیے میں نے تیاری شروع کر دی۔ چونکہ اس سفر کی کامیابی یا ناکامی کی ابھی کوئی قطعی امید نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے سفر کی تیاری بھی اسی انداز سے کی۔ ماسٹر جی کے قافلہ کو بعد کے کسی جہاز میں جگہ ملی تھی، اس لیے طے کیا کہ اپنا بکس ماسٹر جی کے پاس چھوڑ دوں اور اپنے ساتھ صرف بستر، پہننے کے کپڑے اور بقیہ خشک کھانے کا تھیلا رکھ لوں، تاکہ اگر مجھے کہیں پیدل چلنا پڑا تو اپنا سامان خود اُٹھا سکوں۔

میں نے اپنے پروگرام سے ماسٹر جی کو مطلع کر دیا اور انہیں وصیت کر دیا کہ بکس میں جو سامان و کتابیں میں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں، انہیں آپ براہِ کرم مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک اپنے ساتھ لائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سفر میں کامیابی عطا کی اور جدہ اترنے کے بعد آپ لوگوں سے کہیں ملاقات ہوگئی تو ان شاء اللہ یہ چیزیں آپ لوگوں سے وصول کر لوں گا اور اگر خدانخواستہ آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی یا یہ سفر ہی ناکام رہا تو آپ لوگ اپنے سفر سے لوٹتے وقت میری یہ چیزیں فی سبیل اللہ کسی غریب طالب علم کے حوالے کر دیں گے۔

میری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ بستر پر پڑے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ امید و بیم کی فضا میں طرح طرح افکار و خیالات نے دماغ کو الجھائے رکھا۔ بڑی مشکل سے آدھی رات گزرنے کے بعد ہی نیند آئی ہوگی۔ صبح ہوئی تو نمازِ فجر کے بعد ماسٹر جی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ آج کی صبح میرے لیے ایک عجیب صبح تھی، خوشی اور جھجک کی ملی جلی کیفیت مجھ پر طاری تھی، تاہم کوشش کر رہا تھا کہ جھجک و تردد کے بجائے چہرے پر خوشی کا غلبہ رہے۔ میں جلد از جلد جہاز پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آج کے جہاز سے جانے والے حاجی صاحبان اپنے سامان اپنے قلی کے حوالے کر کے بذریعہ ٹمٹم بندرگاہ کی طرف روانہ ہونے لگے تھے۔ میں نے بھی اپنا مختصر سامان

اسی سابق الذکر قلی کے حوالے کر دیا اور ماسٹر جی اور ان کے قافلہ کے دیگر حاجیوں سے سلام مصافحہ کر کے بندگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بندرگاہ پہنچا تو جہاز پر سوار ہونے کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ گودی میں (وہ جگہ جہاں سے مسافر یا مال وغیرہ جہاز پر چڑھتا ہے) سعودی جہاز لنگر انداز تھا۔ حاجی صاحبان قطار در قطار ایک مخصوص سیڑھی سے جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ حاجیوں کے سامان ایک دوسری سیڑھی سے جہاز پر پہنچائے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے قلی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق حاجیوں کے ساتھ میڈیکل کاؤنٹر سے گزرتے اور پاس دکھاتے ہوئے جہاز کی سیڑھی تک پہنچا۔ سیڑھی پر ہی چیکنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا پاس دکھایا اور اوپر اٹھتا ہوا بسم اللہ کہہ کر جہاز پر قدم رکھ دیا۔ اس وقت میری خوشی میں اضافہ ہونا طبعی بات تھی۔ میں خوش وخرم اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہو گیا۔

چونکہ میں حاجیوں کو رخصت کرنے اور انہیں جہاز میں بیٹھانے کے نام سے جہاز پر گیا تھا، اس لیے کچھ دیر تک جہاز کے اندر حاجیوں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ کسی حاجی کی جگہ ٹھیک کر دی تو کسی اور حاجی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کی سیٹ پر پہنچا دیا۔ اس طرح کچھ دیر گزرتے ہی میرا قلی پہنچ گیا۔ اس نے میرا سامان ایک مناسب جگہ پر رکھ کر میرا بستر بھی بچھا دیا اور خدا حافظ کہہ کر وہ دیگر حاجیوں کے سامان کے لیے چل دیا۔

میں چند منٹ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور بے چینی سے جہاز کی روانگی کا انتظار کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ انتظار کی گھڑی لمبی ہوتی ہے، لیکن عملی طور پر یہ وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جسے اس کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جہاز کو تو اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہونا ہی تھا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا یہ دیر کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ جہاز جلد از جلد بمبئی چھوڑ دے، تاکہ دل کو اطمینان ہو جائے کہ اب میں جہاز سے اتارا نہیں جاؤں گا، لیکن وقت بھی عجیب پابند قانون ہے کہ کسی کی رورعایت کرنا نہیں جانتا۔ جوں جوں مجھے تاخیر کا شبہ ہوتا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا یہ جہاز

میرے ہی اترنے یا اتارے جانے کا انتظار کر رہا ہے۔ کبھی مجھے یہ بھی شبہ ہونے لگتا کہ شاید جہاز کے ذمہ داروں کو معلوم ہو گیا ہے کہ رخصت کرنے والوں میں سے ایک شخص ابھی تک جہاز سے نہیں اترا۔

خدا خدا کر کے روانگی کا وقت قریب آیا اور جہاز نے ایک سیٹی بجائی۔ اب دل کو ذرا سکون ملا۔ اب دل کا تقاضا یہ ہو رہا تھا کہ جہاز حرکت میں آ جائے، لیکن اس سیٹی کے بعد بھی کچھ دیر تک جہاز اپنی جگہ پر رکا رہا۔ اب پھر وسوسہ نے مجھے گھیر لیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا جہاز کے ذمہ داران مجھے اتارنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر دل میں خدا سے التجا کرتا رہا کہ اے خدا! مجھے رسوائی سے بچا لے اور اپنی حفاظت و رعایت میں مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرما۔ کچھ دیر بعد پھر سیٹی بجی اور جہاز گودی سے دور ہوتا چلا گیا۔ اب جان میں جان آئی، لیکن پورا اطمینان تو اس وقت ہوا جب بمبئی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اب کھانے پینے کا مسئلہ سامنے تھا۔ جہاز کے گودی سے ہٹنے کے کچھ دیر بعد ہی جہاز کے کھانا کھلانے والے شور مچاتے ہوئے پہنچے کہ ''حاجی صاحب کھانا لے لو، حاجی بابا کھانا لے لو'' میں نے سوچا کہ ایک تو بغیر ٹکٹ کے میں اس جہاز پر بیٹھا ہوں پھر مفت اس کا کھانا بھی کھاؤں! نہیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میرے لیے اپنا چوڑا کھا کر وقت گزارنا ہی بہتر ہوگا۔ سمندری جہاز پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ سر میں کچھ چکر سا محسوس ہونے لگا تو چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ بھوک محسوس ہونے پر تھیلے سے کچھ چوڑا نکال کر چبا لیتا اور پانی پی کر پھر بستر پر لمبا ہو جاتا، لیکن کھانا کھلانے والے جب بھی آتے ''حاجی بابا کھانا لے لو'' کی آواز لگا کر جگا دیتے۔ میں نے دو تین وقت تو جہاز کا کھانا لینے سے گریز کیا، لیکن کب تک ایسا کرتا! اِدھر میرا چوڑا بھی ختم ہوا چاہتا تھا، نیز مسلسل چوڑا چباتے طبیعت بھی اکتاتی جا رہی تھی۔ مزید برآں، اگر جہاز کے کھانے سے گریز کرتا رہتا تو تیسرے یا چوتھے دن فاقہ کشی کی نوبت آ جانی لازمی تھی۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اب جہاز کا کھانا قبول کر لینا چاہیے، پھر اس کے بعد جب بھی

کھانا والے آکر آواز لگاتے تو میں بھی اپنا پلیٹ نکال کر رکھ دیتا اور پوری آسودگی سے جہاز کا کھانا کھالیتا۔

میں جہاز میں جن حاجیوں کے قریب جگہ سنبھالے ہوئے تھا ان سبھوں سے میرا اچھا خاصا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ان سے گپ شپ بھی رہتی تھی۔ قریب میں شیلانگ (صوبہ میگھالیہ) کے کچھ حاجی تھے۔ ان سے بھی دوستانہ تعلق رہا، لیکن ان سے افہام وتفہیم میں دشواری ہو رہی تھی، انہوں نے اپنی زبان کا نام سنگلش بتایا اور وہ اس کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ اتفاق سے ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو ہاتھ میں تسبیح لیے برابر گنگناتا رہتا تھا اور نماز سے اس کا کوئی سروکار نہیں تھا۔ نماز کا وقت آتا اور گزر جاتا، لیکن اسے رکوع و سجود کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ جب حج جیسے بڑے کام میں نکل گیا ہوں تو نماز کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اسے کچھ نصیحت کروں، لیکن زبان کا مسئلہ بیچ میں رکاوٹ بن جاتا تھا۔ اِدھر اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ ایک شخص کو غلطی پر دیکھ کر خاموش رہنا بری بات ہے۔ آخر ہمت کر کے ایک روز اس کے پاس گیا اور سلام کر کے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے بات کرنی شروع کر دی۔ اگر چہ بہت مشکل سے افہام وتفہیم کا مرحلہ طے ہو رہا تھا، لیکن خدا کے فضل سے نماز کی اہمیت اور ترکِ نماز کے خطرات سے اس کو آگاہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بخوشی میری باتیں سنیں اور آئندہ نماز کے اہتمام کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں سلام کر کے اپنے بستر پر واپس آگیا اور اس کے بعد ہر نماز کے وقت وہ نماز پڑھتا نظر آیا۔

قریب والے قافلہ کے حاجیوں میں ایک ضعیف العمر آدمی بھی تھے۔ وہ کمزور ہونے کے ساتھ بخار سے بھی دوچار ہونے لگے۔ میں نے ان کی دیکھ بھال کرنا اپنے لیے ضروری سمجھا اور ڈاکٹر بھی بلا لایا، جس کی وجہ سے اس قافلے کے لوگ میرے ساتھ بہت احترام سے پیش آنے لگے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ احترام کا برتاؤ جاری رکھا، لیکن ایک بات نے میرے احترام کو مجروح کر دیا۔ شاید یہ لوگ ہندوستان کے اس علاقے کے رہنے والے ہیں جہاں کا

ماحول زیادہ تر پیری مریدی اور شرک و بدعت میں ملوث ہے اور اسی شرکیہ ماحول نے ان لوگوں کے عقائد کو گندہ کر رکھا ہے۔

مذکورہ ضعیف العمر بیمار شخص ایک روز بخار کی حالت میں یوں رٹ لگانے لگا کہ ''اے پیرانِ پیر دستگیر! بلا دور کردے'' میں یہ سن کر ان سے متنفر سا ہو گیا اور یہ کہا کہ آپ اللہ کو پکاریں اور اللہ ہی سے دعا مانگیں۔ ایسے موقع پر پیرانِ پیر کو پکارنا بری بات اور شرک ہے۔ میری اس مختصر نصیحت کا شاید ہی اس پر کوئی اثر ہوا ہوگا، کیوں کہ ہندوستان کے اکثر مشرک و مبتدع اپنے بدعی و شرکیہ عقائد میں بہت کٹر ہوا کرتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ اگر چہ مذکوہ بیمار شخص سے مجھے نفرت سی ہو گئی تاہم میں نے اپنا حسن سلوک حسب سابق جاری رکھا، تاکہ میری طرف سے انہیں کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔

سمندری طوفان کی وجہ سے ہمارے جہاز نے راستے میں کچھ زیادہ وقت لے لیا۔ لگ بھگ سات روز کے بعد ہم عدن کے قریب پہنچے۔ اب جہاز یلملم کے حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ حاجی لوگ حج و عمرہ کے اِحرام باندھنے میں مشغول ہو گئے تھے، البتہ وہ حاجی جو پہلے مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے، انہوں نے ابھی اِحرام نہیں باندھا۔ میں بھی بغیر اِحرام ہی رہا، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ میں پہلے مدینہ منورہ جانا چاہتا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ میرے مستقبل کا فیصلہ، یا زیادہ صحیح الفاظ میں، میرے مستقبل کے فیصلے کا ظہور جدہ میں ہونے والا تھا۔ اگر سارے حاجی یہیں سے اِحرام باندھ لیتے تو مجھے بھی مجبوراً اِحرام باندھ کر اپنے آپ کو حاجی ظاہر کرنا پڑتا، بصورتِ دیگر وہیں پکڑا جاتا۔

کچھ دیر کے لیے جہاز عدن میں رکا اور پٹرول وغیرہ لے کر پھر آگے کو روانہ ہو گیا۔ اب ہمارا جہاز بابِ مندوب سے بحر احمر میں داخل ہو رہا تھا۔ بحر کے معنی سمندر یا دریا اور احمر کے معنی سرخ، چنانچہ لفظی اعتبار سے بحر احمر کے معنی ہوئے سرخ سمندر یا سرخ دریا۔ میں اس سے قبل یہی سمجھ رہا تھا کہ اس سمندر کا پانی سرخ ہوگا جبھی اس کا نام بحر احمر رکھا گیا ہے۔ تحقیق کے لیے میں سطح سمندر اور اس کے پانی کو بہت غور سے دیکھنے لگا، لیکن گھنٹوں جہاز کے چلتے رہنے کے

باوجود کہیں بھی سرخ پانی نظر نہیں آیا۔ اب میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر کس مناسبت سے اس کا نام بحر احمر پڑا؟ کچھ غور وفکر کرنے اور سمندر کے کنارے نظر آنے والی پہاڑیوں کو دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ساحل میں جو پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں ان کا رنگ سرخی مائل ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اسی مناسبت سے اس سمندر کا نام بحر احمر پڑ گیا ہو۔

اس سمندر میں سمندری مچھلیوں کا نظارہ کرنے کا بھی اچھا موقع ملا۔ جہاز کے دائیں بائیں سیکڑوں بڑی بڑی مچھلیاں ایک ساتھ سطح سمندر پر چھلانگیں لگا رہی تھیں، گویا اس طرح وہ حاجیوں کی آمد پر اپنی خوشیوں کا اِظہار کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک میں اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔ کچھ مچھلیاں تو چھلانگیں لگاتی ہوئی جہاز کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ شاید وہ حاجیوں کو الوداع کرتے وقت کچھ دیر تک حاجیوں کی ''لبیک اللھم لبیک'' سننا اور اس کے ساتھ چلنا چاہتی تھیں یا یہ کہ وہ جہاز سے مسابقہ کر رہی تھیں۔

پورے نو دن گزرنے کے بعد دسویں رات کی صبح طلوع ہوتے وقت ہمارا جہاز جدہ کے قریب پہنچ گیا۔ جہاز کی رفتار بہت دھیمی ہو چکی تھی۔ جدہ شہر کی روشنی بہت دور دھیمی دھیمی نظر آ رہی تھی اور سورج نمودار ہوتے ہی شہر نظر آنے لگا تھا۔

جدہ میں جہاز سے اترنے کی
ایک ناکام کوشش

کچھ دیر بعد جدہ بندرگاہ کی طرف سے سرکاری لانچ فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے جہاز کے قریب آ گئی۔ جہاز کے عملے نے لانچ کی طرف رسی کی سیڑھی لٹکا دی جو ایک فٹ لمبی اور آدھی فٹ چوڑی لکڑی کے ٹکڑوں کو دونوں سرے سے دو لمبے رسے کے درمیان ایک ایک فٹ دوری پر باندھ کر تیار کی گئی تھی۔ جہاز بالکل دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ لانچ بھی جہاز کے قریب آ کر جہاز کے ساتھ ساتھ ایک ڈیڑھ گز کے فاصلے سے چلتی رہی۔ چند لمحے بعد لانچ سے ایک عربی آفیسر نکلے اور جہاز کی لٹکی ہوئی رسی کی سیڑھی پکڑ کر جہاز پر چڑھنے لگے۔ میں نے جہاز کے عملے سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انہوں نے بتایا: یہ جدہ بحری آفس کے سعودی پائلٹ ہیں۔ اب یہ یہاں سے خود ہی جہاز چلا کر گودی تک لے جائیں گے۔

اب جہاز کی رفتار قدرے تیز ہو چکی تھی اور سعودی پائلٹ اسے گودی کی طرف لیے جا رہے تھے۔ چند منٹوں میں جہاز گودی تک پہنچ گیا اور لنگر اندازی کی کارروائی ہونے لگی۔ اب حاجی صاحبان جہاز سے اترنے کے لیے اپنی اپنی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ کوئی اپنا سامان چیک کر رہا تھا تو کوئی اپنا بستر گول کر کے سعودی قلی کو حوالہ کرتے ہوئے جہاز کی سیڑھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنا مختصر سا سامان بستر کے اندر ڈال کر باندھ دیا۔ اور میرے قریب والے قافلہ نے جس قلی کو اپنا سامان حوالہ کیا، میں نے بھی اسے اپنا بستر تھما دیا۔ چونکہ میرے قریب کا

قافلہ میرے برتاؤ سے بہت زیادہ متاثر ہو چکا تھا اور اس میں ضعیف العمر آدمی کے علاوہ دو عورتیں بھی موجود تھیں، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اترتے وقت بھی میں ان کا تعاون کروں اور اپنی نگرانی میں آسانی کے ساتھ ان سب کو اتار لے جاؤں۔ میں نے ان لوگوں کی اس استدعا کو اپنے لیے غنیمت سمجھا اور انہیں کے جھرمٹ میں اپنے آپ کو نکالنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

میں نے اس قافلے سے کہا کہ اگر آپ لوگ میرے ساتھ بحفاظت اترنا چاہتے ہیں تو یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کریں، میں ذرا سیڑھی کے قریب جا کر اترنے کا راستہ اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کا جائزہ لے کر واپس آتا ہوں۔ پھر میں آپ لوگوں کو اپنے ساتھ مناسب طریقہ پر اتار لے جانے کی کوشش کروں گا۔

بات بڑی معقول تھی۔ سب لوگ مان گئے اور اپنی جگہ بیٹھ کر میری واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں سیڑھی کے قریب آ کر غور سے دیکھتا رہا کہ لوگ کس طرح اُتر رہے ہیں۔ سیڑھی پر پہنچنے سے قبل ہی وہاں متعین سعودی پولیس یہ جاننا چاہتی ہے کہ حاجی کے پاس پاسپورٹ ہے یا نہیں۔ پولیس حاجی کے پاسپورٹ کھول کر اندر کا نام یا فوٹو وغیرہ کی تحقیق نہیں کرتی، بلکہ بعض حاجیوں کو یوں بھی دیکھا گیا کہ ان کا پاسپورٹ ان کے اِحرام کے کپڑے کے کونے میں لپیٹ کر باندھا ہوا ہے اور پولیس اسے کپڑے کے اوپر ہی سے اندازہ کر کے اطمینان کر لیتی ہے اور اسے کھولے بغیر ہی حاجی کو نیچے اترنے کی اجازت دے دیتی ہے۔

اس طرح حالات کا جائزہ لینے سے میرا مقصد ساتھ والے قافلے کو بحفاظت اتارنے سے زیادہ خود اپنے بچاؤ کا طریقہ معلوم کرنا تھا ورنہ اگر میرے پاس ٹکٹ و پاسپورٹ موجود ہوتے تو اس چھوٹے سے قافلے کو سیڑھی کا جائزہ لیے بغیر ہی اپنے ساتھ لے کر آسانی سے اتر سکتا تھا۔

میں نے اس جائزہ سے یہ اندازہ لگایا کہ میرا اترنا ممکن ہے۔ میں نے اس کے لیے دو ترکیبیں سوچیں: ایک گول مول ترکیب یعنی اپنے قافلے کے سارے لوگوں کے پاسپورٹ اپنے ہاتھ میں لے لوں اور سیڑھی کے گیٹ پر آ کر پولیس کو اپنے لوگوں کی طرف متوجہ کر کے یہ

بتاؤں کہ ہمارے اتنے آدمی ہیں اور یہ ہیں ہم سب کے پاسپورٹ، آپ انہیں جانے دیں۔ اس طرح قافلہ کے لوگوں کو آگے بڑھادوں اور آخر میں سارے پاسپورٹ لے کر خود بھی اتر جاؤں۔ اگر خدانخواستہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو دوسری ترکیب یہ اختیار کی جاسکتی ہے کہ اپنے قافلہ کے حاجیوں کے جانے کے بعد ان میں سے کسی ایک کا پاسپورٹ چپکے سے کسی قلی کے ذریعہ واپس منگوالوں اور اسے دکھا کر اتر جاؤں۔

یہ ترکیبیں سوچنے کے فوراً بعد اپنے قافلے کے پاس واپس گیا اور ان سے کہا کہ آپ لوگ سارے پاسپورٹ میرے ہاتھ میں دے دیں اور میرے پیچھے پیچھے چلتے رہیں۔ یہ کہتے ہی قافلہ کے لوگوں نے سارے پاسپورٹ میرے ہاتھ میں دے دیے۔ ان کو کیا معلوم کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہوں۔ وہ لوگ اب تک مجھے صرف ایک جوان حاجی اور دوسروں کا خیرخواہ سمجھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ میرے کہنے کے مطابق میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جب سیڑھی کے گیٹ کے پاس پہنچا تو میں نے پولیس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا کہ یہ سب میرے ساتھی ہیں اور سب کے پاسپورٹ میرے پاس موجود ہیں، آپ انہیں جانے دیں اور پاسپورٹ میرے پاس دیکھ لیں۔

پولیس نے میری بات پر عمل کرنے کے بجائے خود اپنا حکم صادر کر دیا کہ ہر ایک حاجی کو اپنا پاسپورٹ خود اپنے ہاتھ میں لے کر اترنا ہوگا، آپ ان کے پاسپورٹ ان کے ہاتھوں میں دے دیں۔

پولیس کے اس حکم نے میری پہلی ترکیب پر پانی پھیر دیا۔ میں حکم کی تعمیل کرتا ہوا اپنے ہر ایک حاجی کو اس کا پاسپورٹ واپس کرنے لگا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ پولیس کے پاس کھڑے رہ کر ہر ایک حاجی کو اس کا پاسپورٹ تھماتا جاؤں، بلکہ اس کے برعکس صف میں کھڑے اپنے حاجیوں میں سے ہر ایک کو اس کا پاسپورٹ دیتا ہوا قصداً میں نے صف کے آخری کنارے تک پہنچنے کی کوشش کی جہاں اور حاجیوں کی بھیڑ تھی، تاکہ میں پولیس کی نظر سے اوجھل ہوسکوں۔ اگر میں پولیس کے پاس کھڑا ہوکر اپنے ہر حاجی کو اس کا پاسپورٹ دیتا تو آخر میں میرا ہاتھ خالی ہو

جاتا اور پولیس میرے بارے میں شک میں پڑ جاتی، بلکہ ایسی صورت میں پولیس مجھے سیڑھی کے گیٹ پر گرفتار بھی کر سکتی تھی، لیکن میں پاسپورٹ واپس کرتا ہوا لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا اور پولیس کو میرے بارے میں کوئی شبہ تک نہ ہو سکا۔

اب میں جہاز کے اندر چلا گیا اور اپنی دوسری ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کے طریقے پر غور کرنے لگا۔ حاجیوں کے سامان اتارنے کے لیے ابھی تک قلیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں نے جہاز کے اندر ایک قلی سے رازدارانہ طور پر عربی میں بات چیت کی۔ اپنا تعارف طالب علم کی حیثیت سے کرایا اور کہا کہ میں یہاں پڑھنے کے لیے آیا ہوں، لیکن بغیر پاسپورٹ کے ہوں۔ اگر آپ تھوڑا تعاون فرمائیں تو میں یہاں اتر سکتا ہوں۔ جب قلی نے تعاون کے لیے رضامندی ظاہر کی تو میں نے کہا کہ دیکھیے سیڑھی کے قریب جو بس کھڑی ہے اس میں میرے قافلے کے حاجی بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس جا کر میری طرف متوجہ کر کے کہیں کہ پاسپورٹ چاہیے۔ میری طرف متوجہ ہونے پر میں بھی اشارے سے انہیں پاسپورٹ دینے کے لیے کہوں گا۔ جب وہ پاسپورٹ دے دیں تو آپ اسے اپنے کپڑے کے نیچے چھپا کر جہاز پر آجائیں اور مجھے دے دیں۔ میں وہ پاسپورٹ لے کر اترنے کے بعد انہیں واپس کر دوں گا۔

قلی مجھے امید دلا کر کچھ سامان سنبھالے نیچے گیا، لیکن قبل اس کے کہ وہ میرے قافلے کے حاجیوں سے بس پر ملے، بس وہاں سے نکل گئی اور میری یہ ترکیب دھری کی دھری رہ گئی۔

اب میں بہت زیادہ فکر مند سا ہو گیا۔ پھر مجھے ایک اور ترکیب سوجھی کہ جس راستے سے قلی کی آمد و رفت جاری ہے اُدھر سے بھی نکلنے کی گنجائش کا کچھ جائزہ لے لیا جائے۔ جب اُدھر جا کر دور سے گیٹ کا جائزہ لیا تو وہاں بھی پولیس متعین نظر آئی، گویا چپکے سے نکلنے کے تمام راستے بند۔

اب یہ بھی اندیشہ ہونے لگا کہ شاید مجھے بمبئی واپس جانا پڑے۔ اگر خدانخواستہ ایسی بات ہوئی تو میرا سامان جو ابھی تک حاجیوں کے سامان کے ساتھ نیچے پڑا ہوا ہے جہاز پر واپس

منگوالینا ہی بہتر ہے، چنانچہ جہاز کے عرشے پر سے نیچے ایک قلی کو آواز دے کر کہا کہ یہ چھوٹا سا سامان میرا ہے، اسے جہاز پر واپس لاؤ، یہ عربی قلی بڑا دیانتدار نکلا۔ وہ سامان واپس لانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوا۔ شاید وہ یہ سمجھا ہوگا کہ میں جہاز کا آدمی ہوں اور حاجی کا سامان ہڑپنا چاہتا ہوں۔ قلی نے ''ممنوع'' کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

قلی کا یہ معاملہ اگرچہ مجھے اس وقت برا لگا۔ لیکن اس سامان کا واپس نہ آنا ہی میرے لیے بعد میں مفید ثابت ہوا اور پورا سامان مجھے بعد میں مل گیا۔ اگر وہ سامان جہاز پر واپس چلا جاتا تو میرے جہاز سے فرار ہونے کے بعد وہ سامان جہاز پر پڑے پڑے خراب ہو جاتا اور آخر میں اُٹھوا کر سمندر میں پھنکوا دیا جاتا یا جہاز کا عملہ اسے کچھ مدت تک استعمال کر لیتا یا بمبئی واپس جا کر حاجیوں کے سامان کے امانت خانے میں ڈال دیتا۔ بہرحال اللہ جو کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے، خواہ ہم اسے بروقت کچھ سمجھ سکیں یا نہ سکیں۔

قبل اس کے کہ مجھے کوئی
مجرم کہہ کر گرفتار کرے

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ ''مجبوری کا نام بابا جی'' یعنی حصولِ مقصد کے لیے کبھی مجبوراً دوسروں کی منت سماجت کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت میرا حال بھی یہی تھا۔ جہاز سے اترنے کے لیے مجھے اب تک جتنی ترکیبیں سوجھی تھیں سب کی سب بیکار ہوگئیں اور ہر طرف سے راستہ بند پایا۔ اب اکثر حاجی اتر چکے تھے اور مزید ایک آدھ گھنٹے میں بقیہ حاجی بھی اتر جائیں گے۔ سارے حاجیوں کے اتر جانے کے بعد جہاز پر میری موجودگی خود بخود یہ اعلان کردے گی کہ یہ کوئی بے ٹکٹ آدمی ہے، پھر جہاز والے مجھے مجرم کہہ کر گرفتار کرلیں گے۔

جب بات یہاں تک پہنچنے والی ہی ہے تو میں اس سے قبل ہی کیوں نہ اپنے آپ کو ذمہ دارانِ جہاز کے سامنے ظاہر کردوں؟ ممکن ہے وہ لوگ میرے اس رویہ کی وجہ سے میرے ساتھ کچھ مہربانی کا برتاؤ کریں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے کسی پرائیویٹ راستے سے نیچے اُتار دیں۔

میں دل ہی دل میں یہ طے کرکے جہاز کے اندر اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے لگا کہ شاید جہاز کے کسی چھوٹے آفیسر سے ملاقات ہوجائے اور وہ میری حقیقت اور غرض وغایت معلوم کرنے کے بعد نکلنے کا کوئی راستہ دکھادے۔

چند منٹ بعد اتفاق سے ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوگئی جنہیں میں جہاز کا آدمی سمجھ بیٹھا اور ان سے اپنی ضروری باتیں کھل کر کہہ دیں، لیکن بعد میں پتہ لگا کہ وہ جہاز کے آدمی نہیں بلکہ ہندوستانی سفارت خانے کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ جہاز کے لوگ آپ کو کسی بھی

طرح نیچے نہیں اُتار سکتے، اگر آپ کا ایک قدم بھی یہاں کی سرزمین پر پڑ گیا اور یہاں کے سرکاری آدمی کو معلوم ہو گیا تو کمپنی پر سخت جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ البتہ آپ سفیر صاحب سے مل سکیں تو ممکن ہے کہ وہ آپ کو اپنی ذمہ داری پر اُتار لیں۔ سفیر صاحب حاجیوں کے استقبال کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ اسی جہاز پر موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ جناب! میں تو انہیں نہیں پہچانتا، اگر آپ ذرا مہربانی فرما کر مجھے اپنے ساتھ لے چلیں اور ان سے ملوادیں تو بڑی نوازش ہوگی۔

جہاز کے عرشے پر سفیر موصوف جناب قدوائی صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ جہاز کے کیپٹن اور بعض دیگر ذمہ داران بھی موجود تھے اور آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ سفارت خانہ کے اسی غیر معروف مہربان شخص نے مجھے سفیر صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ جناب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

میں نے سفیر صاحب سے سلام و مصافحہ کیا اور اپنا مختصر تعارف کرانے کے بعد کہا کہ میں اعظم گڑھ کے مدرسہ فیض عام مئو میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، لیکن بقیہ تعلیم سعودی عرب میں مکمل کرنے کے شوق سے مجبور ہو کر چپکے سے اس جہاز کے ذریعہ یہاں آ گیا ہوں۔ میرے پاس روپیہ نہیں تھا کہ ٹکٹ خریدتا۔ اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ اگر آپ مہربانی فرما کر مجھے یہاں سے اُتار سکیں تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

سفیر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے؟ میں نے جواب دیا: افسوس کہ میں پاسپورٹ بھی نہیں بنوا سکا۔ وہ معذرت ظاہر کرنے لگے کہ بھئی! اگر تمہارے پاس پاسپورٹ ہوتا تو میں ٹکٹ کا مسئلہ حل کر لیتا، لیکن جب پاسپورٹ ہی نہیں ہے تو میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

جہاز کے کیپٹن اور دیگر ذمہ داران بھی جو سفیر صاحب کے ساتھ موجود تھے ہم دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ سفیر صاحب نے انہیں خطاب کر کے کہا کہ یہ لڑکا آپ کے جہاز سے بغیر پاسپورٹ و بغیر ٹکٹ آیا ہوا ہے، آپ اسے سنبھالیں۔

جہاز پر چند گھنٹے کی نظر بندی

اب میرا حال جہاز کے ذمہ داران کے سامنے عیاں ہو چکا تھا۔ وہ اپنے نظام کے مطابق مجھے بمبئی واپس پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ چونکہ جہاز اس وقت جدہ بندرگاہ کی گودی پر کھڑا تھا، اس لیے انہوں نے اپنے قاعدے کے مطابق مجھے لے جا کر ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ کمرہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ وہاں دو اور بے ٹکٹ و بے پاسپورٹ آدمی پہلے ہی سے نظر بند تھے۔ ان میں سے ایک مجھ سے چھوٹا تھا اور دوسرا میرا ہم عمر یا مجھ سے کچھ بڑا معلوم ہو رہا تھا۔

جب سارے حاجی اُتر چکے اور جہاز کو گودی سے ہٹا کر بندرگاہ کے اندر ہی کچھ دور قدرے گہرے پانی میں لنگر انداز کر دیا گیا تو ہم تینوں نظر بند اشخاص کو کمرے سے نکال کر کھانا کھلایا گیا اور ہر ایک کا نام و پتہ لکھ لیا گیا۔ میں نے اس موقع پر کیپٹن سے درخواست کی کہ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ براہِ کرم مجھے یہاں اُتار دیجیے بڑی مہربانی ہوگی۔ کیپٹن کی طرف سے جواب ملا بھائی! بغیر پاسپورٹ کسی کو دوسرے ملک میں اتار دینا بالکل منع ہے۔ اس لیے ہم قانون کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

نام و پتہ لکھ لینے کے بعد ہمیں دوبارہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے پتے پر ان لوگوں نے ہندوستان تار بھیجا تھا، تاکہ ہمارے بارے میں تحقیق کر سکیں کہ یہ لڑکے کیسے ہیں اور ان کے کیا شغل ہیں۔

ہم جس کمرے میں بند کیے گئے تھے اس میں سخت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے کے

قریب کوئی ذمہ دار شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ہوا کے انتظام کے لیے کچھ کہا جائے۔ آخر ہم تینوں بڑی جدوجہد سے کھڑکی کھول کر کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر جہاز کے عرشے پر کھلی ہوا میں بیٹھ گئے۔

ہمیں باہر دیکھ کر بعض ذمہ دار بھاگم بھاگ ہمارے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ لوگ کیسے نکل آئے؟ ہم نے کہا کہ اندر سخت گرمی ہے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم کھڑکی کھول کر ہوا میں نکل آئے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی اور کچھ دیر تک آپ لوگوں کو اسی کمرے میں رہنا ہے، تھوڑی دیر بعد یہ جہاز پورٹ سوڈان روانہ ہونے والا ہے۔ جہاز روانہ ہوتے ہی آپ لوگوں کا کمرہ کھول دیا جائے گا۔ پھر آزادانہ آپ جہاز پر چلیں پھریں اور جہاں چاہیں آرام کریں۔

پورٹ سوڈان اور جہاز کے اوپر سے

وہاں کے مناظر کا تفریحی مشاہدہ

ہمارا جہاز آفتاب غروب ہونے سے قبل ہی پورٹ سوڈان کے لیے روانہ ہوگیا۔ حسب وعدہ ہمارا کمرہ کھول دیا گیا۔ اب ہم جہاز پر آزادانہ نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ اب ہم جہاز کے عرشے پر کھلی ہوا میں بیٹھ سکتے اور آرام بھی کر سکتے تھے۔ کھانے کے وقت ہمیں بلا کر کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ سونے کے لیے عرشے پر مناسب جگہ تھی اور نیچے تھرڈ کلاس کی ساری سیٹیں خالی پڑی تھیں۔

جہاز کے عرشے پر رات کو بہت دیر تک ہم لیٹے آسمان کے ستاروں کا نظارہ کرتے رہے۔ جب آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو اندر جا کر جہاں جی چاہا سو گئے۔ صبح آنکھیں کھلیں تو جہاز پورٹ سوڈان میں داخل ہو رہا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر پھر جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا، تاکہ اس نئی بندرگاہ کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔

جہاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا گودی تک پہنچ کر رک گیا اور لنگر انداز کر کے سامان اتارنے کا انتظام کیا جانے لگا۔ یہاں ہمارا جہاز دو روز رکا رہا لیکن ہمیں اتر کر شہر کی سیر و تفریح کی اجازت نہیں ملی۔ ہم نے جہاز کے عرشے پر ہی سے اپنی نظری سیر و تفریح پر اکتفا کیا۔ جہاز کے چاروں اطراف پھیلے ہوئے حسین قدرتی مناظر سے ہم دل بہلاتے رہے۔ تیسرے دن یہ جہاز پورٹ سوڈان کو خیر باد کہہ کر واپس جدہ روانہ ہوگیا۔ گیارہ بارہ گھنٹے کا سفر طے کر کے یہ جہاز پھر جدہ پہنچ گیا اور بندرگاہ کے اندر گودی سے کافی دور اسے لنگر انداز کر دیا گیا، لیکن اس بار ہمیں کمرہ میں بند نہیں کیا گیا۔

رہائی کی تمنائیں

اب حج کے لیے صرف دو تین روز باقی رہ گئے تھے۔ جس جہاز پر ہم نیم قیدی کی حالت میں موجود تھے وہ حج کے پانچ چھ روز بعد ہی حاجیوں کو لے کر بمبئی واپس جانے والا تھا۔ میں اپنی رہائی کے لیے فکرمند تھا۔ جہاز کا عملہ جدہ شہر گھومنے اور کچھ عملہ مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے شہر جانے والوں میں سے ایک سے دریافت کیا کہ اگر میں آپ کو کوئی خط دوں تو کیا آپ اسے جدہ میں پوسٹ کر سکیں گے؟ اس نے مستعدی کا اظہار کیا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے عربی میں ایک مختصر سا خط سعودی عرب کے بادشاہ کے نام لکھ دیا اور اسے لفافہ میں بند کر کے اس پر ریاض کا پتہ لکھ دیا۔ خط کا خلاصہ یوں تھا:

"میں ایک طالب علم ہوں۔ فلاں جگہ کا رہنے والا ہوں۔ تحصیل علم کی خاطر گزشتہ سال ہی سے میں آپ کے ملک آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پاس پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے نہ آ سکا۔ اپنی بقیہ تعلیم سعودی عرب میں مکمل کرنے کے شوق سے مجبور ہو کر میں بلا ٹکٹ و بلا پاسپورٹ چپکے سے جہاز پر بیٹھ کر جدہ پہنچ گیا ہوں مگر جہاز والوں نے مجھے جدہ اترنے سے روک دیا ہے۔ اس وقت میں جدہ بندرگاہ میں سعودی نام کے جہاز پر موجود ہوں اور آپ جیسے رحمدل بادشاہ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ جلد از جلد اپنے مخصوص آرڈر کے ذریعہ مجھے اس جہاز سے اتارنے اور اپنے محبوب ملک میں تحصیل علم کی اجازت دے کر ممنون فرمائیں۔ تاخیر کی صورت میں یہ لوگ مجھے اسی جہاز سے چھ سات روز کے بعد بمبئی واپس لے جائیں گے۔ امید ہے کہ آپ میری درخواست پر پہلی فرصت میں غور فرمائیں گے۔ میں نہایت ہی بے چینی سے آپ

کے جواب کا انتظار کروں گا۔''

خط روانہ کرنے کے بعد اپنے آپ کو اطمینان دلاتا رہا کہ سعودی بادشاہ بہت رحمدل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میری موافقت میں کوئی حکم صادر فرما دیں۔ لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' انتظار کی گھڑی لمبی ہوتی گئی۔ تین چار روز کے بعد بے چین سا ہو گیا اور ہر آنے والی لانچ کو اپنے لیے پیغام لانے والی لانچ سمجھنے لگا۔ جب جب کوئی لانچ دیکھتا اس پر نظریں جما دیتا کہ شاید یہ ہمارے ہی جہاز کی طرف آنے والی ہے، شاید اس میں میرا ہی کوئی پیغام موجود ہو، لیکن جب وہ اپنا رُخ بدل کر کسی اور طرف نکل جاتی تو بڑی مایوسی ہوتی۔ اگر اتفاق سے کوئی لانچ اپنے جہاز کے پاس آکر رکتی تو ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا کہ شاید کوئی عربی آفیسر اس سے نکل کر ہمارے جہاز پر آئے اور میرے لیے کوئی پیغام پہنچائے لیکن جب لانچ کے آدمی کے واپس آنے اور واپس جانے کے بعد بھی مجھے کوئی بلاوا نہیں آتا تو حسرت کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

جہاز سے فرار کے منصوبے

عیدالاضحیٰ کی نماز جہاز کے مسلمان عملہ کے ساتھ جہاز پر ہی ادا کی۔ ان لوگوں میں بعض بہت خیر خواہ و مشفق معلوم ہوتے تھے۔ وہ ہمارے بارے میں یہ بھی کہتے تھے کہ ان بے چاروں کو بیکار جہاز پر روکے رکھا۔ اگر انہیں حج کے لیے اتار دیتے تو ان کا بھی حج ادا ہو جاتا وغیرہ وغیرہ۔

عید کے بعد دوسرے ہی روز سے میں نے اپنی رہائی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا خیال کرلیا اور ظاہر ہے کہ اب دوسرا طریقہ فرار کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلے میں نے اپنے ساتھ نظر بند دونوں ساتھیوں کو اس منصوبہ میں شریک کرنا چاہا، لیکن یہ لوگ کچھ کم ہمت ثابت ہوئے۔ ان پر جہاز کے عملہ کی باتیں اثر کر چکی تھیں۔ کیوں کہ یہ عملہ ہمیں تلقین کرتے رہتے تھے کہ سمندر کا پانی بہت بھاری ہوتا ہے۔ اس میں تیرنا بہت مشکل ہے۔ اس سے قبل بھی کئی اشخاص بے ٹکٹ آئے تھے اور جب جدہ میں تیر کر بھاگنے کی کوشش کی تو اس بھاری پانی میں زیادہ دیر تک نہیں تیر سکے اور آخر کار پکڑے گئے۔ ان لوگوں نے ہمیں مزید ڈرانے کے لیے یہ بھی کہا کہ یہاں سمندر میں بڑے بڑے مگرمچھ بھی ہوا کرتے ہیں جو انسان کو پورا کا پورا نگل جاتے ہیں۔

بالکل واضح بات ہے کہ ایسی تلقین کا مقصد ہمیں ڈرانے کے سوا اور کچھ نہیں تھا، تاکہ ہم بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ غالباً میرے دونوں ساتھی اس تلقین سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے۔ ایک تو چھوٹا تھا، لیکن جب میں نے فرار کے بارے میں بڑے ساتھی کی رائے معلوم

کرنی چاہی تو اس نے وہی بات دہرائی جو عملہ سے سن چکا تھا۔

اب میں نے سوچا کہ فرار کے منصوبے میں ان جیسے ساتھیوں کو شریک کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، اس کا الٹا اثر پڑ سکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی کم ہمتی کی وجہ سے منصوبہ ناکام ہوجائے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہے وہ تنہا کیا جائے۔

اب تنہا فرار کے منصوبے کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔ اگرچہ عملہ کی تلقین اور مگرمچھ کے قصہ سے میں نے کوئی خاص اثر نہیں لیا، تاہم مگرمچھ کے تصور سے کچھ خوف سا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فرار کا منصوبہ بنانے سے قبل مگرمچھ کے خوف کو دل ودماغ سے نکال پھینکنا نہایت ضروری ہے۔

جہاں تک سمندری پانی میں تیرنے کا مسئلہ ہے تو یہ میرے لیے آسان ہے، کیوں کہ میں گنگا ندی کے ساحل پر رہنے والا آدمی ہوں اور تیراکی کی اچھی مشق رکھتا ہوں۔ اگر سمندری پانی نمکین ہونے کی وجہ سے کچھ بھاری بھی ہو اور تیرنے والا جلدی تھک جاتا ہو تو اس کا علاج ایک ہلکی سی لکڑی سے ہوسکتا ہے، لیکن یہ مگرمچھ والا مسئلہ ذرا پیچیدہ معلوم ہوتا ہے اور اسے حل کیے بغیر فرار کے منصوبے پر عمل بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آخر کچھ غور وفکر کے بعد ایک علاجِ نظر آ ہی گیا جو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے تقدیر کا سہارا لے کر مگرمچھ کا خوف اپنے دل ودماغ سے نکالنے کی کوشش شروع کردی۔ تقدیر کے مسئلہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا کہ ہر انسان کے لیے موت مقدر ہے، نہ ایک منٹ مقدم ہوسکتی ہے اور نہ مؤخر۔ اگر اللہ تعالیٰ نے میری موت مگرمچھ کے ذریعہ ہی مقدر کر رکھی ہے تو کوئی طاقت مجھے اس سے بچا نہیں سکتی، یہاں تک کہ اگر جہاز والے میری حفاظت کے لیے مجھے رسی سے کہیں باندھ رکھیں تو بھی کسی نہ کسی طرح میں جہاز سے مگرمچھ کے منہ میں پہنچ جاؤں گا اور وہ مجھے ایک تر نوالہ سمجھ کر نگل جائے گا۔ اس کے برعکس اگر میری موت مگرمچھ کے ذریعہ مقدر نہیں ہے اور میرا خشکی تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو مگرمچھ مجھے کبھی نگلنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ بلکہ جہاز والے اگر زبردستی بھی مجھے مگرمچھ کے منہ میں ڈال دیں تو یہ مگرمچھ مجھے نگلنے کے بجائے خود

ہی مجھے اپنے منہ میں رکھ کر خشکی تک پہنچا سکتا ہے۔

جب میں نے تقدیر کے اس عقیدہ کو اپنے ذہن کے اندر کئی بار دہرایا تو خدا کے فضل سے مگر مچھ کا خوف بالکل کافور ہو گیا۔ اب مجھے بالکل اطمینان ہو گیا اور ہمت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔

جہاز کی واپسی میں صرف دو تین روز باقی رہ گئے تھے۔ اب میں نے فرار کے منصوبے پر اچھی طرح غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارا جہاز جس جگہ لنگر انداز تھا اس کے شمال مشرق میں لگ بھگ ایک فرلانگ کی دوری پر ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا جلا ہوا جہاز پتھریلی چٹان پر ٹکا کھڑا تھا۔ یہ چھوٹی سی چٹان سمندری مدوجزر میں کبھی ڈوب جاتی اور کبھی اُبھر آتی۔ اس چٹان کے بعد پانی کا سلسلہ جدہ کی گودی تک پہنچا ہوا ہے۔ جہاز سے گودی کی مسافت قریب قریب ایک میل رہی ہوگی۔ چونکہ مجھے رات کے وقت فرار ہونا تھا اور رات کے اندھیرے میں تیرتے ہوئے غلط سمت میں نکل جانے سے نئی مصیبت پیش آسکتی تھی، اس لیے جدہ ایئر پورٹ کی سگنل روشنی کو جو لحہ بہ لحہ چمکتی رہتی تھی اپنے لیے رات کی رہنما متعین کر لیا، تا کہ اندھیرے میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔

جب میں اس طرف سے مطمئن ہو گیا تو خیال آیا کہ اگر میں رات کو گودی کی طرف نکل جاتا ہوں تو وہاں خشکی پر پہنچ کر ایک دوسری مشکل پیش آسکتی ہے، ممکن ہے وہاں کسی سرکاری آدمی سے مڈبھیڑ ہو جائے یا گودی پہرے دار مجھے دیکھ لے تو آخری رات میں اس جگہ مجھے مشکوک آدمی سمجھ کر پکڑ بھی سکتا ہے۔ چنانچہ طے کیا کہ یہ راستہ میرے لیے مناسب نہیں۔ اب میں اِس راستہ سے فرار کا منصوبہ منسوخ کر کے کسی متبادل راستے کی تعیین کے بارے میں سوچنے لگا۔

دوسرا راستہ گودی سے کچھ ہٹ کر یا تو جنوب مشرق کی طرف اختیار کیا جا سکتا تھا یا شمال مشرق کی طرف۔ جنوب والا راستہ زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوا، کیوں کہ اس راستہ میں مسلسل پانی ہی پانی تھا اور اُدھر کچھ جہاز بھی لنگر انداز تھے اور ساحل سے آبادی قریب تھی۔ اس کے

برعکس شمال مشرق کا راستہ صاف تھا اور ساحل کے قریب کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ مسافت اگرچہ جنوب مشرق کی نسبت لمبی یعنی دو میل سے کچھ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن درمیان میں کئی جگہ ریتے کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے نما خشکی بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے یہ راستہ اختیار کرنا مناسب سمجھا اور آنے والی رات میں اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کا ارادہ کرلیا۔ اب سامنے صرف یہ مسئلہ رہ گیا تھا کہ جہاز کے اوپر سے پانی تک کیسے پہنچا جائے۔ اسے حل کرنے کے لیے پہلا منصوبہ یہ بنایا کہ رات کو جب جہاز کے سارے لوگ سو جائیں اور جہاز میں بالکل سناٹا چھا جائے اُس وقت جہاز کے عرشے پر پڑی ہوئی ایک فٹ چوڑھی اور تین چار گز لمبی لکڑی لے کر جہاز کے عرشے ہی سے چھلانگ لگا دی جائے۔ جلد بازی میں ایسا سوچ تو لیا، لیکن اس پر مزید غور نہیں ہوسکا اور رات کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا۔ مغرب کی نماز ادا کر لی گئی۔ اب رات کے آٹھ بج گئے۔ ہم کھانے سے بھی فارغ ہو گئے اور عشاء کی نماز پڑھ کر اللہ سے خوب خوب التجا کی کہ اے اللہ! تو مجھے یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب کر اور جس مقصد کے لیے آیا ہوں وہ آسان کر دے۔

نو دس بجے رات کو جہاز کے سب لوگ یکے بعد دیگرے اپنے اپنے بستر پر دراز ہونے لگے۔ میں جہاز کے عرشے پر اس لکڑی کے بازو میں لیٹ گیا جسے میں جہاز سے خشکی تک اپنا ہمسفر بنانا چاہتا تھا۔ یہ لکڑی جہاز کے عرشے پر ایک کنارے کسی کام کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ میں وہاں لیٹے لیٹے سب کے سو جانے کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اب میں اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار تھا۔ میرے پاس پہننے اور اوڑھنے کے علاوہ مزید کوئی خاص کپڑا نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تیرنے کے لیے صرف گُچھا سے لنگوٹی کس کر بقیہ کپڑے سر پر لپیٹ لینا چاہیے، تاکہ ساحل تک پہنچنے کے بعد خشک کپڑے پہن کر شہر میں داخل ہوسکوں۔

میں مذکورہ لکڑی کے بازو میں ایک ہلکی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اب میں نے چادر کے

نیچے لیٹے ہی لیٹے گچھا سے لنگوٹی باندھ لی اور بقیہ کپڑے اتار کر سر پر لپیٹ لیے، البتہ یہ چادر، جس کے نیچے چھپ کر یہ ساری کارروائیاں کرتا رہا، آخری وقت تک جسم پر جوں کی توں رہنے دی، تاکہ کوئی مجھے تیاری کی حالت میں دیکھ نہ سکے۔

اب جہاز کے تقریباً سارے لوگ سو چکے تھے۔ صرف کہیں سے کسی مستری کے کام کرنے کی کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی۔ اس آواز کے ختم ہونے کا مجھے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب یہ مستری بھی کام ختم کر کے سو چکا ہے تو میں نے سر سے چادر ہٹا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ محسوس ہوا کہ ہر طرف سناٹا ہے۔ اب میں اپنی جگہ بیٹھ گیا اور چادر ہاتھ پر رکھ کر جوں ہی اِرادہ کیا کہ اب اسے بھی سر پر لپیٹ لوں، کچھ دور ایک شخص میری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ شاید یہ وہی مستری رہا ہوگا جس کی کھٹ کھٹ کی آواز کچھ دیر پہلے سنائی دے رہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی جھٹ سے لیٹ گیا اور جلدی سے چادر کو پورے جسم پر پھیلا دیا، لیکن اس خوف سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ شاید اس شخص نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا ہے۔ کچھ دیر تک یہ انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ میرے پاس آئے گا اور کچھ کہے گا، لیکن جب اس نے میرا کوئی نوٹس نہیں لیا اور آگے بڑھ گیا تب مجھے اطمینان ہوا اور جان میں جان آئی۔

اس طرح چھلانگ لگانے کا منصوبہ ملتوی ہو گیا اور اس پر مزید غور کرنے لگا۔ اس پروگرام پر دوبارہ عمل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک فاش غلطی کا احساس ہوا اور وہ یہ کہ اگر میں جہاز کے عرشے ہی سے لکڑی لے کر پانی میں چھلانگ لگا دوں تو اس سے بہت زور کی آواز پیدا ہوگی جس سے جہاز کے عملہ کے جاگ جانے کا خطرہ ہے۔ پھر مزید شور وغل ہوگا اور آخر میں پکڑا جاؤں گا۔ نہیں، جہاز کے عرشے سے چھلانگ لگانے کا منصوبہ ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آج پروگرام ملتوی کر دیا جائے اور کل دن کو سوچ سمجھ کر ایسا منصوبہ بنایا جائے کہ زیادہ اونچائی سے چھلانگ نہ لگانی پڑے اور لکڑی بھی چھوٹی اختیار کی جائے۔ اس رات کا پروگرام ملتوی ہوتے ہی میں نے چادر کے نیچے ہی نیچے اپنا لباس تبدیل کر

لیا اور کچھ دیر بعد اطمینان سے سو گیا۔

جب صبح جاگا تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھی۔ کچھ دیر بعد ناشتہ کیا۔ پھر عرشے پر اِدھر اُدھر گھومتے گھامتے اور لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے جہاز کی بالکل نچلی منزل تک پہنچ گیا۔ وہاں گول گول کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ قریب میں ایک ڈیڑھ گز لمبی اور آدھی فٹ چوڑی کچھ لکڑیاں بھی نظر آئیں جن کے ذریعہ جہاز کے تہ خانے کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں سے چھلانگ لگانا مناسب رہے گا۔ کیوں کہ سطح سمندر سے یہاں کی اونچائی عرشے کی بہ نسبت ایک تہائی سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ یہاں حالات کا جائزہ لینے کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر تفریحی انداز میں چکر لگاتا ہوا جہاز کے عرشے پر جا کر آنے والی رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

خدا کے فضل سے رات آئی اور بڑی مبارک بن کر آئی۔ میں اس رات نیچے جانے والے زینے کے پاس لیٹ گیا۔ جب آدھی رات گزر گئی اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب سب لوگ سو گئے ہیں، تو چپکے سے اُٹھ کر نچلی منزل میں اتر گیا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کھڑکی کے پاس پہنچا جہاں سے میں نے پانی میں چھلانگ لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جب کھڑکی سے جھانک کر پانی کی طرف دیکھا تو اب بھی کافی فاصلہ محسوس ہو رہا تھا۔ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے بڑی اچھی باتیں دماغ میں ڈال دیں اور سہولتوں کے سامان دیکھ کر میں نے چھلانگ لگانے کے منصوبے میں قدرے تبدیلی کر دی۔

اب یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر یہاں سے بھی لکڑی لے کر چھلانگ لگائی جائے تو بھی کچھ نہ کچھ آواز ضرور پیدا ہوگی، لہٰذا تیرنے کے لیے لکڑی کے بجائے کیوں نہ تکیہ نما لائف جیکٹ کا سہارا لیا جائے۔ چھت کی طرف اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہی لائف جیکٹ مل گیا۔ میں نے بسم اللہ کہہ کر وہاں سے دو لائف جیکٹ نکال کے کھڑکی سے پانی میں گرا دیے۔ لائف جیکٹ کے پانی میں گرتے ہی چٹاک سی آواز پیدا ہوئی اور اس آواز نے میرے چھلانگ لگانے کے بارے میں مجھے مزید سوچنے پر مجبور کر دیا، روئی کا بنایا ہوا یہ تکیہ نما لائف جیکٹ نے، جس کا وزن بالکل

معمولی سا ہے، یہاں سے پانی میں گرتے وقت اتنی آواز پیدا کردی تو میرے بھاری جسم کے اس اونچائی سے پانی پر گرتے وقت کئی گنا زوردار آواز پیدا ہونا لازمی بات ہے۔

جی نہیں، چھلانگ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے بجائے کوئی ایسی رسی تلاش کی جائے جسے پکڑ کر بلا آواز پانی تک پہنچا جا سکے۔ پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور حسن اتفاق سے قریب ہی سوت کا بنا ہوا فیتا نما پائپ کا گولا مل گیا۔ میں نے اس کی تہہ کھول کر اس کا ایک سرا کھڑکی سے پانی تک لٹکا دیا جہاں دونوں لائف جیکٹ سمندری چھوٹی چھوٹی لہروں کے ساتھ ساتھ متحرک تھے۔ ادھر پائپ کے دوسرے سرے سے مزید چند تہہ کھول کر جہاز کے اندر ایک مضبوط لوہا سے باندھ دیا اور اب خود کو اس کھڑکی سے باہر نکالنے کی تیاری کرنے میں لگ گیا۔

پروگرام کے مطابق گمچھا سے لنگوٹی باندھ لی اور بقیہ کپڑے سر پر لپیٹ لیے اور بسم اللہ کہہ کر اپنے آپ کو کھڑکی کے سامنے حاضر کر دیا۔ پہلے سر نکالا تو محسوس ہوا کہ اس طرح نکلنے سے سر نیچے اور پاؤں اوپر ہو جائیں گے اور مجھے پھر کسی نئی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نہیں، ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ پاؤں پہلے نکالے جائیں اور آخر میں سر، تاکہ باہر ہونے کے بعد سر اوپر اور پاؤں نیچے رہیں پھر آسانی سے وہ فیتا نما پائپ پکڑ کر پانی تک پہنچا جا سکے۔

پاؤں پہلے نکالنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے قریب والا لوہا اچھی طرح پکڑ لیا اور دونوں پاؤں کو کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ اب بقیہ جسم کو آہستگی کے ساتھ باہر کی طرف کھسکانے لگا۔ جب سینہ کا حصہ کھڑکی کے دائرہ میں پہنچا تو وہیں اٹک کر رہ گیا۔ دونوں ہاتھ اندر کا لوہا چھوڑ چکے تھے اور گردن و سر کے ساتھ مل کر اس پوزیشن میں ہو گئے تھے کہ ان سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جسم کو کتنا ہلایا، لیکن سینہ کا حصہ باہر کی طرف کھسکتا ہی نہیں تھا۔ اب میں بہت فکر مند ہو گیا۔ نہ باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر، کیوں کہ باہر کی طرف کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر پاؤں لگا کے دھکا دے کر اپنے آپ کو اندر کر سکوں۔ خدانخواستہ اگر میں باہر نہ نکل سکوں اور نہ اندر داخل ہو سکوں تو صبح تک مجبوراً مجھے اسی حالت میں لٹکے رہنا پڑے گا اور صبح جہاز والے بڑی آسانی سے مجھے پکڑ کے لے جائیں گے۔ خدا سے التجا کرنا شروع کر دیا کہ اے

خدا! مجھ پر رحم کر اور مجھے رسوائی سے بچا لے!!

اللہ تعالیٰ نے فوراً ایک ترکیب سوجھا دی۔ سوچا کہ اپنے آپ کو کچھ سکیڑنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ سانس نکال کر ممکن حد تک اپنے آپ کو سکیڑ لیا اور ادھر اُدھر کچھ حرکتیں کرنی شروع کر دیں۔ جسم بھی اس پریشانی میں پسینہ پسینہ ہو گیا تھا جس سے جسم میں پھسلن و چکناہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ خدا کے فضل سے اب سینہ کا حصہ بھی آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگا اور جب سینہ بالکل آزاد ہو گیا تو سر آسانی سے نکال لیا۔ اب اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا فوراً ایک ہاتھ سے کھڑکی کا کنارہ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے باہر لٹکا ہوا پائپ پکڑ کر اپنا توازن ٹھیک کیا۔ نیچے نظر ڈالی تو دونوں لائف جیکٹ گویا بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اب میں کھڑکی کو خیر باد کہہ کر دونوں ہاتھوں سے پائپ پکڑتا ہوا آہستہ آہستہ پانی تک پہنچ گیا اور دونوں بغلوں میں ایک ایک لائف جیکٹ دبائے "بسم اللہ" کہہ کر تیرنا شروع کر دیا۔

مقدر میں کیا ہے معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سمندر کے اسی پانی میں میرا خاتمہ مگرمچھ کے نوالے کی صورت ہی میں ہو جائے۔ اگر ایسی نوبت آ ہی جائے تو بہتر ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو اور کلمہ شہادت زبان پر جاری رہے۔ اب دل کی زبان سے (أشهد ان لا اِلٰه إلا الله وأشهد ان محمدًا رسول الله) کی رٹ لگاتا ہوا متعینہ سمت کی طرف بڑھنے لگا۔ لگ بھگ آدھا فرلانگ تیرنے کے بعد خیال آیا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھوں کہ آیا مجھے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ خدا کی پناہ! جہاز پر نظر پڑتے ہی دیکھا کہ کئی آدمی جہاز کے کنارے کھڑے ہیں اور ایسا لگا گویا وہ میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنا منہ پھیر لیا اور اُدھر دوبارہ دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اب مجھے اندیشہ ہو گیا کہ کسی بھی لمحہ پکڑا جاؤں گا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ اے اللہ! رسوائی سے بچا لے۔ اب میں تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے پیچھے کسی پکڑنے والی لانچ کی آواز نہیں آئی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ جہاز سے میری طرف دیکھنے والے شاید وہ لوگ ہوں گے جو جہاز پر ہمارے خیر خواہ معلوم ہوتے تھے اور ہمیں

جہاز پر رو کے رکھنے پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔

اب میں اس چھوٹی سی چٹان کے قریب پہنچ رہا تھا جو جہاز سے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر واقع تھی اور ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا جہاز اس پر ٹیک لگائے پڑا تھا۔ میں تیرتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک محسوس ہوا کہ کوئی چیز نیچے سے پاؤں کو چھو رہی ہے۔ اب میں کلمہ شہادت مزید مستعدی سے پڑھنے لگا کہ شاید مگر مچھ پہنچ گیا ہے اور میرا بھی آخری وقت آ گیا ہے۔ جب اس کے بعد بھی میرے پاؤں مسلسل کسی چیز کو چھوتے ہی جا رہے تھے اور میں تیرتا جا رہا تھا لیکن کوئی مخالف حرکت محسوس نہیں ہو رہی تھی، تو میں نے ہمت کر کے چھونے والی چیز کو پاؤں سے ٹٹولنے کا اِرادہ کر لیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا چیز ہے۔ جوں ہی میں نے چھونے والی چیز پر پاؤں جمایا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک طرف خدا کا شکر ادا کرتا جا رہا تھا اور دوسری طرف خود اپنے آپ پر ہنسی بھی آ رہی تھی، کیوں کہ میں گھٹنے بھر پانی میں تیر رہا تھا اور خود اپنے پاؤں زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔

اب زمین پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور مزید اطمینان کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آیا مجھے کوئی پکڑنے تو نہیں آ رہا ہے؟ اللہ کا بہت بڑا فضل رہا کہ پیچھے کوئی آتا نظر نہیں آیا، البتہ چھوڑے ہوئے جہاز کی دھندلی سی شکل کافی دور نظر آ رہی تھی۔ اب دونوں لائف جیکٹ کو اپنے کندھے پر رکھ کر آگے بڑھا۔ چند قدم چلتے ہی اس چھوٹے سے چٹانی ٹیلے تک پہنچ گیا جو ٹوٹے جہاز سے متصل واقع تھا۔

اگرچہ گہرے پانی والا مرحلہ طے کر لیا تھا، لیکن آگے مسافت بہت لمبی تھی۔ اب آگے بڑھا تو قریب سے کسی کشتی نما کالی دھندلی چیز سے دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید یہ لوگ مچھلی پکڑنے والے تھے اور یہ آواز اسی سمت سے آ رہی تھی جدھر مجھے جانا تھا۔ میں آگے بڑھتا رہا اور سوچا کہ کشتی والوں سے مل کر درخواست کروں کہ وہ مہربانی کر کے مجھے ساحل تک چھوڑ آئیں۔ اگر مان جائیں تو ان کا شکریہ ادا کر کے کشتی پر بیٹھ جاؤں گا ورنہ اپنا راستہ پکڑ کر آگے بڑھتا چلوں گا۔

اب میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کشتی کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی کشتی کچھ دور ہی تھی کہ میں نے ''السلام علیکم'' کہہ کر کشتی والوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ میں ایک انسان اتنی رات کو آپ لوگوں کی طرف آ رہا ہوں اور میں مسلمان بھی ہوں۔ انہوں نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا، دوبارہ جب ''السلام علیکم'' کہا تو انہوں نے ''وعلیکم السلام'' کہہ کر جواب دیا۔ اس کے بعد چلتا ہوا میں ان کے قریب پہنچ گیا اور کشتی سے دو چار گز دور کھڑے ہو کر ان سے عربی میں بات چیت شروع کر دی۔

انہیں بتایا کہ میں ایک طالب علم ہوں۔ اس جہاز سے آیا ہوں۔ جہاز والے مجھے اترنے نہیں دے رہے تھے، اس لیے اتنی رات کو چپکے سے نکل کر تیرتا ہوا یہاں پہنچا۔ اگر آپ لوگ مہربانی فرما کر اپنی کشتی میں مجھے ساحل تک پہنچا دیں تو بہت زیادہ ممنون ہوں گا۔

کشتی والوں نے کہا: بارک اللہ فیک، مزید کہا کہ اللہ آپ کی مدد کرے۔ ہماری طرف سے آپ کو ساحل تک پہنچا دینے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن حکومت کی طرف سے ایسا کرنا منع ہے۔ اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں تو ہمیں حکومت پکڑ کر سزا دے گی، اس لیے ہم معذور ہیں۔ آپ اللہ پر بھروسہ کر کے چلتے رہیں، ان شاء اللہ پہنچ جائیں گے۔

میں نے سنا تھا کہ عرب لوگ، جو بدو قسم کے ہوتے ہیں، اپنے قول کے بڑے پکے ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے مزید اصرار کرنا فضول ہے۔ انہوں نے میرے حق میں جو دعائے خیر کی، یہی میرے لیے بہت ہے۔ میں انہیں سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔

میں جب چٹانی ٹیلے سے دوبارہ پانی میں اترا تھا تو اپنے دونوں ہم سفر لائف جیکٹ کو کندھوں سے اُتار کر پانی پر رکھ دیا تھا اور ان کے لمبے فیتے پکڑ کر اپنے پیچھے کھینچتا جا رہا تھا۔ جب پانی سینہ تک پہنچ جاتا تو دونوں لائف جیکٹ بغلوں میں دبا کر تیرنے لگتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانی کا اندازہ لگانے کے لیے پاؤں کو زمین کی طرف بڑھا دیتا۔ اگر پانی کم معلوم ہوتا تو چلنے لگتا اور زیادہ محسوس ہونے پر تیرتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا۔ لائف جیکٹ نے بڑا کام دیا۔ لگ بھگ میل سوا میل تیرنے کے بعد بھی کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں

ہوئی۔ بیچ بیچ میں ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے نما خشکیوں سے گزرنا پڑا۔ ان ریتیلے ٹیلوں پر پرندے بھی آرام کر رہے تھے۔ اتنی رات میرا وہاں سے گزرنا شاید ان کے آرام میں خلل ڈال رہا تھا، اس لیے وہ احتجاج کرتے ہوئے ایک ساتھ چہچہانے لگتے تھے یا وہ اپنے قریب سے ایک طالب علم کو گزرتے ہوئے دیکھ کر بطور استقبال ایک ساتھ زندہ باد کا نعرہ لگا رہے تھے۔ میں وہاں سے گزر کر جب اگلے پانی میں اتر جاتا تھا تو وہ پرندے خاموش ہو جاتے تھے۔

صبح طلوع ہونے والی ہی تھی۔ ادھر میں بھی ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اب پانی بالکل تھوڑا تھا اور میں لائف جیکٹ کے فیتے پکڑ کر انہیں کھینچتا ہوا پیدل چل رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے پانی کا سلسلہ ختم ہوا اور فجر کے وقت حقیقی ساحل نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے سر سے لپیٹے ہوئے کپڑے اتارے اور گمچھا بدل کر خشک لباس پہن لیا۔ گمچھا دھونے اور وضو کرنے کے لیے دوبارہ سمندری پانی میں اترا۔ گمچھا دھویا اور نچوڑ کر اسے جیب میں ڈال لیا، پھر وضو کر کے خشکی پر جا کر نمازِ فجر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے سمندری ہم سفر دونوں لائف جیکٹ کو ریت کے نیچے چھپا دیا۔ تا کہ کوئی ان کی بے حرمتی نہ کرے۔ اللہ کے فضل سے بلا ٹکٹ سفر یہاں پر ختم ہوا، لیکن یہ ارادہ کر لیا کہ جہاز سے آنے کا کرایہ اور اس سے قبل بنارس سے بمبئی تک بلا ٹکٹ ریل سفر کرنے کا کرایہ، ان شاء اللہ بعد میں کسی مناسب موقع پر سرکار کو ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ مستقل طور پر ہندوستان واپس ہونے کے کچھ روز بعد اس ارادے کو بھی عملی جامہ پہنا دیا۔ ایک روز کسی سفر کے ارادے کے بغیر سرکار کے خزانے میں تین سو ساٹھ روپے (۳۶۰) جمع کر کے ریلوے ٹکٹ لے کر اسے پھاڑ کے پھینک دیا اور بفضل الٰہی اس طرح ایک ذہنی بوجھ ہلکا ہو گیا۔

سمندر کے کنارے عرب سرزمین پر جہاں میں نے فجر کی پہلی نماز پڑھی ساحل کا وہ علاقہ تھا جو آبادی سے کافی دور واقع تھا۔ یہاں فجر کے بعد بھی کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ اب میں

نے یہاں سے شہر کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ کچھ کھاڑی نما علاقے سے گزرتا ہوا شہر کے قریب پہنچا۔ جب شہری لوگوں سے ملاقات ہوئی تو سلام کر کے مدینۃ الحجاج کا پتہ دریافت کیا، جہاں حاجی لوگ آتے جاتے وقت کچھ مدت کے لیے ٹھہرتے ہیں۔ کچھ مشرق جنوب کی طرف چلا تو بغدادیہ کے علاقے میں داخل ہوا۔ پھر کچھ دیر چل کر پوچھتے ہوئے مدینۃ الحجاج پہنچ گیا۔

جہاز میں میرے پاس ایک یا سوا روپیہ موجود تھا جسے میں نے جہاز کے عملہ کے پاس سعودی ریال میں اس خیال سے بدل لیا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجھے ہندوستان واپس کر دیا جائے تو یہ سعودی ریال میرے پاس ایک یادگار رہے گا۔ جب میں مدینۃ الحجا پہنچا تو وہ ایک ریال میرے پاس موجود تھا۔ اب ناشتہ کا وقت گزرتا جا رہا تھا اور مجھے بھوک بھی لگ چکی تھی۔ میں نے ہوٹل سے ربع ریال یعنی ایک چوتھائی ریال کی ایک ڈبل روٹی خریدی اور ساتھ ہی تھوڑا سا نمک مانگ لیا۔ مدینۃ الحجاج کی مسجد کے کنارے بیٹھ کر نمک روٹی سے ناشتہ کیا۔ کچھ روٹی بچ گئی تو دوپہر کے لیے محفوظ رکھا۔ اپنے گھر میں بھی ہم خوشی خوشی نمک سے روٹی کھا لیتے تھے، لیکن اپنے گھر میں نمک کے ساتھ مرچ مسالے اور تیل بھی ملائے جاتے ہیں جس سے روٹی کھانے میں لطف آتا ہے۔ آج روٹی خالص نمک سے کھائی گئی، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک تو یوں ہی پیسہ نہ ہونے کے برابر تھا اور اب جو کچھ بچا تھا اسے آئندہ کے لیے محفوظ رکھنا تھا۔ بھوک سے نمٹنے کے بعد سوچا کہ مدینۃ الحجاج میں ٹھہرے ہوئے حاجیوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، شاید اپنے جان پہچان کے کچھ حاجی مل جائیں اور ممکن ہے جو حاجی بمبئی میں یا جہاز پر میرے ساتھ تھے وہ حج سے فارغ ہو کر اب مدینہ منورہ جانے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہوں۔ میں نے ایک ایک کمرہ چھان ڈالا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں ملا۔

البتہ کچھ حاجی ایسے نظر آئے جو میرے ساتھی تو نہیں تھے، لیکن رنگ ڈھنگ، لباس اور وضع قطع سے وہ اپنے علاقے کے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ان کو سلام کر کے حالات وجائے سکونت دریافت کیا۔ میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ وہ سب کے سب میرے ضلع پورنیہ

(کٹیہار) کے رہنے والے تھے، بلکہ ان میں سے بعض تو میرے ایک قدیم استاذ کالو مولوی کے گاؤں ''شہریا'' کے رہنے والے بھی تھے۔ یہ حاجی لوگ رمضان کے مہینے ہی میں آئے ہوئے تھے اور دو ایک روز کے بعد پہلے جہاز سے واپس جانے والے تھے۔ یہ لوگ مجھے تو نہیں جانتے تھے، لیکن میرے ماموں مولانا ابوبکر ہارونی (رحمہ اللہ) کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان لوگوں کے اس مختصر تعارف سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ مولانا ابوبکر صاحب میرے حقیقی ماموں ہوتے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ مولانا تو ہمارے یہاں کے بڑے مدرسہ سیما پور کے ہیڈ مولوی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کے اس بڑے مدرسہ میں بھی دو تین سال پڑھا ہوں۔

اب میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ جب یہ حاجی لوگ ایک دو روز کے اندر اندر واپس جانے ہی والے ہیں تو انہیں اب مزید پیسہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ دو ایک روز کے اخراجات کے بعد اگر ان کے پاس کچھ پیسے بچ سکیں تو کیوں نہ ان سے یہ بچے ہوئے پیسے بطورِ قرض لے لیے جائیں اور ہندوستان میں ماموں مولانا ابوبکر ہارونی صاحب کے ذریعہ انہیں ان پیسوں کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے؟

میں نے ان لوگوں کو اپنے آنے کا مقصد بتا کر ان کے بچے ہوئے پیسے مجھے بطور قرض دینے کے بارے میں کہا اور یہ بھی کہا کہ میں آپ لوگوں کو ایک خط اپنے ماموں مولانا ابوبکر ہارونی کے نام لکھ دیتا ہوں۔ آپ لوگ یہ خط دکھا کر یہ پورا پیسہ ان سے لے لیں گے، لیکن افسوس کہ یہ حاجی لوگ مجھ پر اعتماد نہ کر سکے، بلکہ اس بارے میں متردد نظر آنے لگے اور کھل کر کوئی جواب بھی نہیں دیے۔

میں توقع کر رہا تھا کہ ایک ایسے مولانا جنہیں یہ حاجی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور جنہیں اپنے بڑے مدرسہ کا ہیڈ مولانا بھی مانتے ہیں، ایسے مولانا صاحب کے بھانجے کو یہ لوگ اپنے بچے ہوئے پیسے قرض دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے، لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ جب انہوں نے اپنے آدمی کو اپنا نہیں سمجھا، میں نے بھی ان سے مزید

کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور موضوعِ گفتگو بدل کر دیگر امور کے بارے میں چند باتیں کیں، پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان حاجی لوگوں سے پھر کسی وقت ان کے گاؤں میں ملاقات ہو جائے اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں وہی عطاء الرحمن ہوں تو انہیں ضرور افسوس ہو گا کہ تعارف ہونے کے باوجود ہم نے اپنے آدمی سے اجنبی جیسا برتاؤ کیا۔

جدہ سے مکہ مکرمہ کے لیے پیدل روانگی

جب میں اپنے علاقے کے حاجیوں سے قرضہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گیا تو یہ ارادہ کرلیا کہ اب میں پیدل ہی مکہ مکرمہ روانہ ہو جاؤں گا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سخت دھوپ پڑ رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ یہ پیدل سفر شام کے وقت شروع کیا جائے، تاکہ ٹھنڈے وقت میں چلنے سے کوئی زیادہ تکلیف محسوس نہ ہو۔ یہ بھی طے کیا کہ جب رات چاندنی ہے تو رات کے وقت مسلسل چلتے رہنا چاہیے، اگر کہیں تھکاوٹ محسوس ہوئی تو وہیں کچھ دیر تک رک کر آرام کرلیا جائے گا۔ اگر اس طرح سفر جاری رکھا جائے تو ان شاء اللہ العزیز تین چار روز میں منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاؤں گا۔

میں دوپہر کو مدینۃ الحجاج کی مسجد میں لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ جب ظہر کی اذان ہوئی تو وضو کر کے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ دوبارہ کچھ بھوک محسوس ہونے پر صبح کی بچی ہوئی سوکھی روٹی سے اس کا قدرے علاج کرلیا اور مسجد ہی میں لیٹے لیٹے عصر کا انتظار کرنے لگا۔ جب عصر کی اذان ہوئی اور نماز سے فارغ ہو گیا تو اپنے سفر کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

چونکہ میں اپنی چپل جہاز ہی پر چھوڑ آیا تھا، تاکہ اس کا وزن سمندری پانی میں تیرتے وقت میرے لیے مزید دشواری کا باعث نہ بنے، اس لیے اب میرے پاؤں خالی تھے، وہاں کی پختہ و پتھریلی سڑک پر بغیر جوتا چپل چلنا تکلیف دہ محسوس ہونے لگا تھا، اس لیے سوچا کہ ایک جوڑی چپل کا انتظام ضرور کیا جائے۔ میرے پاس زیادہ پیسہ بھی نہیں تھا کہ نئی چپل خرید سکوں اور بغیر چپل سفر شروع بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس مسئلے کا حل یوں نکالا گیا کہ مسجد

کے دروازے کے کنارے لاوارث جوتے چپلوں کے پڑے ہوئے ڈھیر کے قریب سے دائیں بائیں ملا کر ایک جوڑی چپل منتخب کرلیا۔ دوسروں کے چپل اُٹھانے میں جھجک محسوس کررہا تھا اور دل ہی میں شرمندگی بھی محسوس ہورہی تھی۔ لیکن اس مجبوری کی حالت میں اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میری یہ حرکت چوری شمار کی جائے، چنانچہ میں اللہ سے اس عمل کے لیے معافی مانگتا رہا اور بعد میں اس جیسی چپل کے برابر قیمت فقیر کو خیرات کردی۔

پروگرام کے مطابق عصر بعد سفر شروع کرنا چاہتا تھا، لیکن اس وقت بھی جدہ کی دھوپ گرم اور زمین تپی ہوئی تھی۔ دھوپ کی حدت میں کمی ہونے کے انتظار میں کچھ دیر اور مسجد میں ٹھہر گیا۔ جب مغرب میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو مدینۃ الحجاج کو الوداع کہہ کر مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ مجھے مکہ کا راستہ معلوم نہیں تھا، لیکن لوگوں سے پوچھتا ہوا اس راستہ پر پہنچ گیا جو سیدھا مکہ مکرمہ کو جاتا ہے۔

سعودی عرب میں رائٹ سائڈ ٹرافک ہے یعنی دائیں طرف سے چلنے کا نظام ہے اور یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے، جو فطری تقاضے کے عین مطابق ہے۔ میں سڑک کا دایاں کنارہ پکڑ کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف چلتا رہا۔ ابھی جدہ شہر تجاوز کرنے میں ڈیڑھ میل باقی تھا کہ مغرب کا وقت ہوگیا۔ راستے کے کنارے کچھ لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر تک ریت پر بیٹھ کر اور لیٹ کر ستا لیا اور پھر بسم اللہ کہہ کر چلنا شروع کردیا۔

اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا، لیکن چند منٹ کے بعد ہی مشرقی افق سے چمکتا ہوا چاند نمودار ہوا اور اندھیرے میں کمی واقع ہونے لگی۔ چاندنی کی وجہ سے قرب وجوار کے چلنے والے نظر آرہے تھے اور جب سڑک پر پیچھے سے کوئی گاڑی آتی تھی تو اس کی روشنی سے دور دور کی چیزیں نظر آجاتی تھیں۔ چلتے چلتے مجھے کچھ پیاس محسوس ہوئی۔ سڑک کے دوسرے کنارے ایک چھوٹی سی دوکان نظر آئی۔ میں نے وہاں پہنچ کر دوکاندار کو سلام کیا اور عربی زبان میں اپنی پیاس کا اظہار کرتا ہوا ان سے تھوڑا پانی طلب کیا۔ دوکاندار بیچارے بہت شفقت سے پیش آئے اور

انہوں نے اپنے پاس رکھا ہوا پانی کا پیالہ مجھے پیش کر دیا۔ اگرچہ پانی کچھ گرم ہی تھا لیکن شدت پیاس کی وجہ سے میں نے بسم اللہ کہہ کر اسی پانی سے اپنے آپ کو سیراب کر لیا۔

مجھے بمبئی میں ''تسہیل حج'' اور ''رہنمائے حج'' نام کے دو پمفلٹ ملے تھے۔ انہی پمفلٹ کے ذریعہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جدہ سے روانگی کے بعد امِ دود نامی مقام پر ایک پولیس چوکی ہے جہاں مکہ مکرمہ جانے والے ہر ایک مسافر کی تفتیش ہوتی ہے۔ وہاں پر مسافر کو پاسپورٹ دکھانا پڑتا ہے۔ اگر پاسپورٹ ساتھ نہ رہا تو وہاں سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔

پانی پی کر میں نے سوچا کہ دوکاندار سے معلوم کر لیا جائے کہ امِ دود کی پولیس چوکی یہاں سے کتنی دور ہے۔ پوچھنے پر اس نے جواب دیا کہ ابھی کافی دور ہے، لیکن ساتھ ہی اس نے میرے اس سوال سے بھانپ لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''حاجی بابا! باسبورت مافی، یعنی کیا بات ہے حاجی صاحب! آپ کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے کیا؟ مجھے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور چونکہ یہ دوکاندار پانی پیش کرتے ہوئے بہت مشفق و مخلص معلوم ہوا، اس لیے میں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے قدرے تفصیلی بات کر لی۔ میں نے کہا کہ میں ایک طالب علم ہوں۔ علم حاصل کرنے کے لیے مکہ مکرمہ پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ امِ دود میں بہت سخت تفتیش ہوتی ہے، اس لیے براہِ کرم آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتا دیجیے جہاں سے جانے پر میں پولیس کی تفتیش سے بچ سکوں۔ دوکاندار نے مجھے ہمت دلائی اور کہا کہ راستہ تو یہی ہے، لیکن آپ نہ ڈریں، اللہ پر بھروسہ کر کے چلتے رہیں، ان شاء اللہ نکل جائیں گے، اللہ لطیف وخبیر ہے۔

میں سلام کر کے وہاں سے روانہ ہو کر راستہ کے کنارے کنارے چلتا رہا اور دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ اے اللہ! تو مہربان ولطیف وخبیر ہے۔ تو اپنی مہربانی سے مجھے پولیس کی گرفت سے بچا لے اور صحیح سلامت مکہ مکرمہ پہنچا دے۔

امدادِ خداوندی کا ایک عجیب وغریب طریقہ

ابھی کچھ ہی دور چلا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے آسانی سے مکہ مکرمہ پہنچنے کا ایک ذریعہ پیدا کردیا۔ راستہ کے بائیں طرف سے ایک شخص کی آواز آنے لگی۔ وہ زور زور سے پکار رہا تھا کہ یا شیخ! لو سمحت، باللہ ساعدنا قلیلًا ...... یعنی اے شیخ! خدا کے واسطے مہربانی فرما کر ہماری تھوڑی مدد کردیجیے۔ اگرچہ میں بلانے والے کا عربی لہجہ پوری طرح نہیں سمجھ رہا تھا، کیوں کہ میں نو وارد تھا اور وہ بہت جلدی جلدی بول رہا تھا، تاہم اس کے یا شیخ یا شیخ! کہنے سے اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ مجھے کسی ضرورت کے لیے بلا رہا ہے۔

میں رُخ بدل کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے راستے کے کنارے ایک کار کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا ''باللہ، دفوا معنا قلیلًا'' میں دفوا کا مطلب نہیں سمجھ رہا تھا، لیکن اس کے اشارے سے اور کار کے پیچھے چند آدمیوں کو مستعد کھڑے دیکھنے سے سمجھ گیا کہ یہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ کار کو دھکا دینے کو کہہ رہا ہے۔

جب میں کار کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ پیچھے کے پہیے ریت میں دھنس گئے ہیں اور کار اسٹارٹ کرتے وقت پہیے تو گھوم رہے ہیں، لیکن پہیے کے نیچے سے ریت اُڑ جانے کی وجہ سے گاڑی آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ اب میں بھی ان لوگوں کے ساتھ گاڑی کو پیچھے دھکیلنے لگا۔ پہیے کے گھومنے پر نیچے کی ریت اڑ اڑ کر اتنا گڈھا ہو گیا تھا کہ ہم سب مل کر پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود گاڑی کو آگے نہ بڑھا سکے۔ ہم لوگوں نے کئی بار زور آزمائی کی، لیکن اپنے کو ناکام دیکھ کر مزید آدمی بلانے کا فیصلہ کیا۔ ہم میں سے ایک آدمی راستے کے کنارے جا کر کھڑا

ہو گیا اور ایک لاری روک کر ڈرائیور کو بلا لایا۔ لاری ڈرائیور نے بھی ہمارے ساتھ اس کار کو دھکا دیا لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ پھر ایک ٹیکسی والے کو روکا جو جدہ کی طرف سے آ رہا تھا۔ اب ہم سب لوگ مل کر پھر سے دھکا دینے لگے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اب لاری والا وہاں سے چل دیا اور ٹیکسی والا بھی اپنی ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھا کر ٹیکسی والے کے قریب پہنچا اور عربی زبان میں دریافت کیا کہ کیا آپ مکہ مکرمہ جانے والے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پھر کہا جناب! میں بھی مکہ مکرمہ جانا چاہتا ہوں، اگر آپ اپنی گاڑی میں مجھے بیٹھا لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اب اس نے مجھے یہ سوال کر دیا کہ آپ حاجی ہیں؟ میں نے کہا کہ طالب علم ہوں، تحصیل علم کے لیے مکہ مکرمہ جانا چاہتا ہوں۔ میرا جواب سن کر وہ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحے بعد جب اس نے سر اُٹھایا تو میں نے دریافت کیا کہ آپ نے کیا طے کیا؟ اب اس گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''ارکب'' یعنی سوار ہو جائیے۔ میں ''بارک اللہ فیک'' کہہ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل اللہ کا بہت شکر ادا کیا۔

اب ہماری گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی مکہ مکرمہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اگر چہ یہ عشاء کا وقت تھا لیکن ابھی تک فضا گرم تھی اور گاڑی کے اندر بھی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے قمیص اُتار دی اور صرف بنیان جسم پر رہنے دیا۔ گاڑی پوری رفتار سے چل رہی تھی اور میں سیٹ پر ٹیک لگا کر آرام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چونکہ آگے اِم دود پولیس چوکی پر تفتیش کا اندیشہ تھا اور میں بلا پاسپورٹ چل رہا تھا، اس لیے دل ہی دل میں اپنے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پولیس چوکی نظر آئی اور ہماری گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی گئی۔ قریب پہنچ کر ڈرائیور نے راستہ کے دائیں کنارے پولیس چوکی کے روبرو گاڑی روک دی اور گاڑی کے اندر کی بتی جلا دی۔ جب پولیس نے گاڑی کے اندر نظر ڈالی اور اس میں مجھ جیسے بنیان پہنے مزدور قسم کے نوجوان کے علاوہ اور کوئی خاص آدمی نہیں دیکھا تو اس نے کسی قسم کی تفتیش کیے بغیر ہی

ہمیں آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کر دیا اب ہماری گاڑی پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی اور میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی سیٹ پر ٹیک لگا کر مختلف قسم کے خیالات و افکار میں محو ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ڈرائیور کو کہہ کر گاڑی میں بیٹھ تو گیا، لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ مجھ سے کتنا کرایہ طلب کرے گا۔ بہر حال، میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ میرے پاس اس وقت جو پونا ریال موجود ہے مکہ مکرمہ اتر کر میں اسے یہ پیش کر دوں گا اور اس سے یہ کہہ کر معذرت کر لوں گا کہ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ میں یہ طے کر کے پھر مکہ مکرمہ کے تصورات میں کھو گیا۔ اب گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور ایک مقھی (یعنی چائے کی دوکان) کے پاس رک گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے اُتر کر مجھے بلایا کہ ''تعال نشرب شاهي''، یعنی آیئے ہم چائے پئیں''، میں نے سوچا کہ ایک تو اس نے مہربانی کر کے مجھے گاڑی میں بیٹھا لیا جس کا میں پورا پیسہ بھی نہیں دے سکتا، اب میں اس پر چائے کا مزید بوجھ نہیں ڈالوں گا، چنانچہ میں نے ''بارك الله فيك، أنا لا أشتهي'' کہہ کر معذرت کر دی یعنی اللہ آپ کو برکت دے، مجھے چائے کی اشتہا نہیں ہے۔ اب وہ تنہا چائے پینے کے لیے مقھی کے اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔

مقھی والا چائے بنانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ ڈرائیور سے میرے بارے میں کچھ دریافت بھی کرنے لگا۔ مقھی والا مجھ جیسے ایک معمولی آدمی کو تنہا ٹیکسی میں دیکھ کر ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا کہ اس سے کتنا کرایہ طے ہوا ہے؟ اس پر ڈرائیور نے جواب دیا کہ فی سبیل اللہ، یہ طالب علم ہے اور قرآن وحدیث پڑھتا ہے۔ میں ان لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ مقھی والا یہ جواب سن کر بہت خوش ہوا اور اسے برکت کی دعائیں دیں۔ مقھی والے کی خوشی تو اپنی جگہ تھی ہی، لیکن اس سے زیادہ مجھے اس جواب سے خوشی ہوئی، کیوں کہ میں کرایہ کے سلسلے میں فکر مند تھا اور صرف اپنے پاس موجود پونا ریال دے کر معذرت کرنا چاہتا تھا، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ پونا ریال بھی ڈرائیور مجھ سے نہیں لے گا اور اسے میں کسی اور ضرورت میں لگا سکوں گا۔

ڈرائیور کے اس مشفقانہ برتاؤ سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور اب یہ محسوس کرنے لگا کہ

میں نے ڈرائیور کی چائے کی پیشکش رد کر کے غلطی کی ہے۔ اگر میں نے اس کے ساتھ چائے پی لی ہوتی تو شاید وہ زیادہ خوش ہوتا۔ اگر اس نے آئندہ راستے میں پھر کوئی کھانے پینے کی پیشکش کی تو میں بلا جھجک قبول کر لوں گا۔

ڈرائیور کے چائے سے فارغ ہوتے ہی گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اب اس نے مجھے اگلی سیٹ پر بیٹھا لیا۔ ہماری گاڑی پھر پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ڈرائیور نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالی۔ میں نے سمجھا شاید وہ مجھے سگریٹ پیش کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو بغیر کسی تردد کے قبول کر لوں گا اور اگرچہ میں سگریٹ نہیں پیتا تاہم صرف اس کی دلجوئی کے لیے مصنوعی طور پر کش لگا لگا کر اس کا ساتھ دیتا رہوں گا، لیکن اتفاق سے اب کی بار اس نے مجھے کوئی پیشکش نہیں کی۔ شاید اسے یہ معلوم تھا کہ علمائے دین سگریٹ کو مکروہ یا حرام سمجھتے ہیں اور میں نے انہیں اپنے کو طالب علم بتایا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے مجھے سگریٹ پیش کرنے کی ہمت نہیں کی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے مکروہ چیز سے بچا لیا۔

اس وقت رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔ اب ہماری گاڑی مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ حدودِ حرم سے قبل بھی ایک پولیس چوکی نظر آئی۔ یہاں ایک دو سیکنڈ کے لیے گاڑی رکی، لیکن کوئی خاص تفتیش نہیں تھی اور فوراً اشارہ ملتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ چند منٹ بعد ہم حدودِ حرم میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں راستہ کے دونوں کنارے مخصوص دیوار نما سیمنٹیڈ بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں ''ابتداء حدودِ حرم'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ میں مسنون دعا پڑھتا ہوا حدودِ حرم میں داخل ہوا اور مکہ مکرمہ کے تصورات میں پھر سے کھو گیا۔ چند منٹ میں ہماری گاڑی مکہ مکرمہ شہر کے اندر داخل ہونے لگی اور جنت المعلی (مکہ مکرمہ کا قبرستان) کے راستے سے چلتی ہوئی ایک مقھی کے سامنے جا کر رک گئی۔ ڈرائیور اُترا اور مجھے بھی اترنے کے لیے اشارہ کر کے کہا کہ ہم مکہ پہنچ گئے ہیں، اگر آپ حرم شریف جانا چاہیں تو یہ راستہ ہے، چلے جائیں۔ میں نے گاڑی سے اُتر کر ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور سلام

ومصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اس وقت مجھے کافی بھوک لگ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہاں کھانے کی کوئی چیز مل جائے تو خرید کر کھا لوں گا، پھر وضو کر کے حرم شریف چلوں گا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، لیکن کھانے کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تھوڑا آگے جانے کے بعد حرم شریف کے اِرد گرد کھانے کی سیکڑوں چیزیں مل جائیں گی۔ میں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت رات کافی ہو چکی ہے اس لیے ساری دو کانیں بند ہو گئی ہیں۔ میں وضو کے لیے پانی کا نل تلاش کر ہی رہا تھا کہ ایک کیلا بیچنے والا نظر آیا۔ اس کے پاس کیلے کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا، صرف دو تین کیلے رہ گئے تھے۔ میں نے اس سے قیمت دریافت کی، لیکن اللہ اسے ہدایت دے، اس نے ایک ایک کیلے کا دام پاؤ پاؤ ریال بتایا۔ مجھے یہاں کے حالات سے کچھ واقفیت نہیں تھی، اِدھر مجھے بھوک بھی کافی لگی ہوئی تھی، چانچہ آدھے ریال میں دو کیلے لے لیے اور پاؤ ریال اپنے پاس باقی رکھا۔ اب میں نے دونوں کیلے چھیل کر جلدی جلدی حلق سے اتار لیے، لیکن چھوٹے چھوٹے ان دو کیلوں سے مجھ جیسے ایک نوجوان کی بھوک کیسے مٹ سکتی تھی، تاہم پانی پی کر اتنے پر ہی قناعت کی۔

اب میں وضو کر کے حرم شریف پہنچنا چاہتا تھا۔ راستہ چلنے والوں سے دریافت کیا کہ حرم شریف کس طرف ہے؟ انہوں نے کہا یہی سامنے ہے، ہمارے ساتھ آ جایئے، ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔ چند منٹ بعد جب ہم حرم شریف کے قریب پہنچ گئے تو انہوں نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کرے کہا اُدھر چلے جاؤ، وہ حرم شریف نظر آ رہا ہے۔ میں دیکھتے ہی رؤیت کعبہ کی دعا پڑھنے لگا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے اپنے مقدس گھر تک پہنچا دیا۔ اب وہی خانہ کعبہ میرے سامنے تھا جسے میں سیکڑوں بار تصویر میں دیکھ چکا تھا اور جہاز پر نیم قیدی رہتے وقت خواب میں بھی دیکھا تھا۔

اب میں آہستہ آہستہ خانہ کعبہ کے قریب ہوتا گیا اور پوچھتا ہوا باب بنی شیبہ سے داخل ہوتا ہوا طواف شروع کرنے کے لیے حجر اسود کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں

تھی۔ صرف چند لوگ طواف کر رہے تھے۔ میں نے بھی ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کہہ کر حجر اسود کو چوما اور طواف شروع کر دیا۔ سات چکر پورے کرنے کے بعد مقامِ ابراہیم کے پاس سنت طواف ادا کی، پھر خانۂ کعبہ کے پاس پہنچ کے ملتزم سے چمٹ کر دعا و استغفار کیا اور متعدد خطرات و مصائب کا سامنا کرنے اور ان سے بچ نکلنے کے بعد اس مقدس مقام تک پہنچ پانے کی خوشی میں بہت بہت آنسو بہائے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کی کہ اے اللہ! تو آگے کے مراحل بھی آسان کر دے۔

اس کے بعد میں نے عشاء کی نماز ادا کی، پھر اس خیال سے مطاف (طواف کرنے کی جگہ) کے کنارے کنارے چاروں طرف پھیلی ہوئی کنکڑیوں پر چکر کاٹتا رہا کہ شاید اپنا کوئی جان پہچان کا حاجی مل جائے۔ کنکڑیوں پر سوئے ہوئے حاجیوں پر سرسری نظر ڈالتا گیا، لیکن اپنا کوئی حاجی نظر نہیں آیا۔ آخر یہ طے کیا کہ اس وقت میں بھی کسی ایک جگہ کنکڑیوں پر سو کر آرام کروں اور ان شاء اللہ فجر کی نماز کے بعد پھر تلاش کرنا شروع کر دوں گا۔

صبح اذان ہوئی تو اُٹھ کر آبِ زم زم سے وضو کیا اور لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ حرم مکی میں پہلی باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مطاف کے ارد گرد ایک چکر لگایا، لیکن اس بار بھی جان پہچان کا حاجی نہیں ملا۔ اب یہ طے کیا کہ سورج طلوع ہونے کے بعد اپنے حاجیوں کے معلم کا پتہ پوچھتا ہوا ان کے آفس تک پہنچ جاؤں گا پھر وہاں سے اپنے حاجیوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

اپنے ملاقاتی حاجیوں کے معلم کا نام عبدالقادر امین تھا۔ بعض لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا آفس محلہ جیاد میں ہے۔ پوچھتا ہوا محلہ جیاد پہنچ کر مذکورہ معلم کے آفس کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ اچانک اپنے ایک حاجی سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی قریب آکر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور آنسو بہاتے ہوئے دریافت کیا کہ بابا! تم اب تک کہاں تھے؟ ان کے بعد اور بھی دو تین جان پہچان حاجیوں سے راستے میں ملاقات ہوگئی۔ وہ جلدی جلدی مجھے ڈیرے میں لے گئے اور قافلہ کے تمام لوگ بیٹھ کر بہت توجہ سے میرے مکہ

مکرمہ تک پہنچنے کی کہانی سننے لگے۔ میں نے شروع سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ یہ لوگ سن کر بہت حیرت زدہ ہوئے اور اکثر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو تک نکل آئے، خاص کر وہ حاجی صاحب جنہوں نے بمبئی میں ایک ساتھ رہتے وقت مجھے اپنا دوست بیٹا بنایا تھا، ان کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ یہ آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ ہچکیاں لے لے کر روتے جا رہے تھے۔ قصہ سننے کے بعد ان میں سے ایک شخص نے مجھے اپنا دوست بنانے کا اعلان بھی کر دیا۔ اس طرح میں نے اپنا بچھڑا ہوا پہلا قافلہ پا لیا اور جو سامان بمبئی میں ان کے پاس چھوڑ آیا تھا وہ سب کا سب مجھے مل گیا۔

چند روز تک میں انہیں لوگوں کے ساتھ رہا۔ ایک روز اپنے جہاز والے قافلے کے ایک آدمی سے حرم شریف میں اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ جنہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سے مجھے ملایا۔ وہ لوگ بھی میرے بارے میں متفکر تھے اور اب مجھے پا کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے جہاز کا پورا سامان ان کے پاس محفوظ ہے۔ میں ان کے ساتھ ان کے ڈیرے پر گیا اور اپنا سامان اُٹھا لایا۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہا شکر ہے کہ اس نے میرا کوئی سامان ضائع نہیں ہونے دیا اور سارے کا سارا مکہ مکرمہ تک پہنچا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے''۔

حجاز میں

دینی وسیاسی مدوجزر

۱۶/اکتوبر ۱۹۲۴ء سے قبل حجاز حکومتِ اُردن کے زیر انتظام تھا جب کہ جزیرۂ عرب کے باقی وسیع تر علاقہ (نجد واِحساء) پر سعودی حکومت کا کنٹرول تھا۔

حجاز پر سعودی قبضہ اور اس کا پس منظر

نجد واحساء کے علاقے میں شاہ عبدالعزیز آل سعود کی حمایت سے شیخ الاسلام علامہ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی دعوت پھیل چکی تھی اور شرک وبدعت کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس حجاز میں غیراللہ کا توسل پکڑنا یا اس سے مدد مانگنا و دیگر قسم کے شرکیہ وبدعی اعمال لوگوں میں رائج تھے۔

نجد کے علماء چاہتے تھے کہ وہ اپنی اصلاحی تحریک حجاز تک پہنچائیں، لیکن وہاں کے عوام وحکام اس تحریک کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے جس کی وجہ سے اس تحریک کو وہاں پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

حجاز پر اردن کے شاہ شریف حسین کی سرپرستی کے زمانے میں پورا حجاز شرک وبدعت کا گہوارہ بن چکا تھا اور یہاں بدامنی وخون ریزی اور چوری وڈاکہ زنی کا بول بالا تھا۔ قبروں کو سجایا جاتا تھا۔ اہل قبور کا وسیلہ لیا جاتا تھا اور ان سے مرادیں مانگیں جاتی تھیں۔ مسافروں کے جان ومال کی حفاظت کرنے میں یہاں کی حکومت مکمل طور پر ناکام تھی۔ حجاج کے قافلے محفوظ

طریقے پر شاذ و نادر ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے تھے۔ کسی بھی قافلہ کے مال و متاع پر قبضہ کرنے کے لیے انہیں گولی مار کر قتل کر دینا ایک مرغوب مشغلہ بن چکا تھا، یہاں تک کہ کسی مسافر کو گولی مارنے کے بعد اگر اس کے پاس کوئی مال برآمد نہ ہوتا تو یہاں کے ڈاکوؤں کو اس بے گناہ شخص کی جان ضائع ہونے پر کوئی افسوس ہونے کے بجائے صرف اپنی گولی ضائع ہوجانے پر افسوس ہوتا تھا اور نجد سے حج کے لیے جانے والے حجاج کے قافلے بھی اس ظلم وزیادتی کے شکار ہوتے رہتے تھے۔

اس دوران حکومت نجد کے شاہ عبدالعزیز آلِ سعود اور حکومت اردن کے شاہ شریف حسین کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے اور تعلقات کی یہ خرابی اس وقت زیادہ نمایاں ہوگئی جب شاہ شریف حسین نے نجد کے لوگوں کو حج کے لیے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

نجد کے موحد علماء و حکام نے اپنے دینی و اصلاحی کام کو حجاز تک پھیلانے اور اپنے حجاج کے قافلے کو مامون و محفوظ کرنے کے لیے متفقہ طور پر اس بات کو ضروری قرار دیا کہ اب حجاز پر فوج کشی کر کے اسے اپنے کنٹرول میں لیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے طائف پر چڑھائی کی اور معمولی جدوجہد سے شریف کی فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد سعودی فوج نے مکہ مکرمہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ معرکۂ طائف کے بعد شریف حسین کا بیٹا علی حسین والی حجاز اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ مکہ چھوڑ کر جدہ بھاگ کھڑا ہوا اور سعودی فوج انتہائی پرامن طریقے پر ۱۶/۱۰ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوگئی، پھر چند دنوں کے بعد سعودی فوج نے جدہ کا محاصرہ کر کے اس پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح مزید کسی مزاحمت کے بنا پورے حجاز پر سعودی حکومت کا مکمل قبضہ ہوگیا۔

حرمِ مکی و مدنی کی توسیع

میں جس وقت سعودی عرب پہنچا تھا وہ حرمِ مکی تر کی توسیع کے بعد پہلی سعودی توسیع کا دور

تھا۔ حرم شریف کی توسیع کے لیے اردگرد کے مکانات توڑے جا چکے تھے اور موجودہ منارے والی آٹھ رکنی عمارت کی بنیاد کھودی جا رہی تھی اور لوہے یا سریا کی جالیں بیسمنٹ میں بچھائی جا رہی تھیں۔ حرم شریف کی اس مسجد کی توسیع کے ساتھ ساتھ مسعی کو یعنی صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کی جگہ کو دو منزلہ بنانے کی تمہید بھی ہو چکی تھی۔ اس توسیع کے بعد حاجیوں کی کثرت کے پیش نظر اس مسجد کی پھر سے توسیع کرنی پڑی۔ اب اس میں کئی کئی لاکھ نمازی ایک ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔

مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کی پہلی توسیع میرے سعودیہ پہنچنے سے پہلے ہو چکی تھی، لیکن مزید توسیعات بعد میں عمل میں آئیں۔ الحمدللہ، یہ مسجد بھی بہت شاندار اور اچھی بنائی گئی ہے اور اس میں بھی کئی لاکھ نمازی ایک ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔

حجاز میں اِصلاحی کارنامے

حجاز پر سعودی قبضہ ہوتے ہی وہاں شرعی احکام نافذ کرنے کا اعلان ہوا۔ مسافر کا سفر مامون بنانے اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے لیے قصاص وحدود کے احکام پر سختی سے عمل شروع ہو گیا۔ شرک و بدعت پر کاری ضرب لگاتے ہوئے اونچی سجائی ہوئی قبروں کو توڑ کر ان کی اونچائی شریعت کے مطابق صرف ایک بالشت بنا دی گئی اور اہل قبور و بزرگوں کا وسیلہ پکڑنا یا ان سے مرادیں مانگنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

اس طرح چند مہینوں میں حجاز کی بھی کایا پلٹ گئی اور ایک لمبے عرصے کے بعد مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے حسین چہروں پر، جنہیں خود غرض شخصیت پرستوں نے شرک و بدعت کے عملی دھبے لگا کر مسخ کر دیا تھا، توحید کا اصل رنگ نکھر آیا، گویا اللہ تعالیٰ نے سعودی حکومت کے ذریعہ پھر ایک بار ''جاء الحق وزهق الباطل، إن الباطل كان زهوقًا'' کی اسلامی تاریخ دوہرا دی۔

حجاز پر سعودی حکومت کے کنٹرول ہونے سے پہلے اس حرمِ مکی میں حنفی، شافعی، مالکی

حنبلی کے نام سے چار الگ الگ مصلے قائم تھے اور کسی ایک مذہب کے مسلمان دوسرے مذہب کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ جب ایک مذہب کے مصلے میں باجماعت نماز ہوتی تھی تو دوسرے مذہب والے بیٹھے بیٹھے اپنے مذہب کے وقت وامام کے انتظار کرتے تھے، لیکن حجاز کے سعودی کنٹرول میں آتے ہی اس غیر شرعی تفریق جماعت پر پابندی عائد کردی گئی اور حرم شریف کے تمام نمازیوں کو صرف ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا، البتہ چاروں مصلوں کے اماموں کے لیے مختلف نمازوں میں باری باری امامت کرنے کا نظام قائم کردیا گیا۔

اب یہاں لوگوں کے جان ومال محفوظ ہو گئے۔ مسافروں اور حاجیوں کے قافلے لٹے جانے یا قتل کیے جانے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اب چور یا ڈاکو کا خطرہ لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا۔ پہلے مال کے ساتھ جان بچا کر منزلِ مقصود تک پہنچنا مشکل ہو گیا تھا، لیکن اب پرائے مال کی طرف بری نظر سے دیکھنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی، بلکہ اب لوگ ہزاروں لاکھوں کے نقود واموال دوکانوں میں کھلے چھوڑ کر بلاخوف وخطر نماز کے لیے چلے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک کپڑا یا رومال سے ڈھانک دیتے ہیں اور باجماعت نماز پڑھ کر واپس آنے کے بعد وہ اپنے مال ومتاع جوں کے توں محفوظ پاتے ہیں۔

اللہ کے فضل وکرم سے اس طرح کے امن وسکون کا ماحول پورے سعودی عرب میں عام ہے۔ وہاں اب چوری کا معاملہ شاذ ونادر ہی پایا جاتا ہے اور کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آتا بھی ہے تو اس کے ارتکاب کرنے والے اکثر غیر ملکی ہوتے ہیں جو اپنے ملک کی عادت کے مطابق لالچ میں آکر ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں، لیکن پکڑے جانے پر اسلامی شریعت کے مطابق لوگوں کے مجمع کے سامنے ان کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں اور دوسروں کی عبرت کے لیے وہ کٹے ہوئے ہاتھ مسجد کے باہر کسی اونچی لکڑی پر چار پانچ روز تک لٹکائے رکھتے ہیں۔ میں نے کئی بار ایسے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

سعودیہ میں امن وسکون کا احساس

سعودی عرب کے امن وسکون کا احساس اس شخص کو زیادہ ہوگا جو دو چار سال وہاں رہ کر اپنے ملک واپس آیا ہو جہاں اسے قدم قدم پر اپنا مال لٹ جانے یا جیب کٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

مجھے اس کا کچھ عملی تجربہ بھی ہے۔ میں اپنے ملک ہندوستان میں کئی بار اپنی جیب کٹوا چکا ہوں۔ مارکیٹ گھومیے یا بس میں چلیے، بہرحال چوکنا رہیے ورنہ اپنی جیب کی خیریت نہیں۔ میں پہلی بار ڈھائی تین سال سعودی رہ کر ہندوستان واپس آیا تو مجھے پہلے ہی کی طرح جیب کترا ماحول کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ روز کے بعد جب دوبارہ بحرین کے راستے سعودی عرب واپس گیا تو وہاں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک غیر محفوظ جگہ سے نجات پا کر کسی مامون واطمینان بخش جگہ پر قدم رکھ کر قلبی سکون حاصل ہو گیا ہو۔ دل کے اس معنوی سکون کا احساس اس شخص کے مادی سکون کے احساس سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا جسے گرم وتپتی دھوپ میں چلنے کے بعد کسی ایئر کنڈیشن روم میں داخل ہوتے ہی اچانک ٹھنڈک وجسمانی سکون محسوس ہونے لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہاں اس طرح کا امن وسکون اسلامی شریعت کے نفاذ کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ دیگر مسلم ممالک کے حکام وذمہ داران کو بھی توفیق دے کہ وہ بھی اپنے یہاں اسلامی شریعت کا نفاذ کر کے اپنے عوام کو امن وسکون سے زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کریں اور وہ خود اپنی آخرت محفوظ بنالیں۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر

مدرسہ خیریہ عارفیہ میں داخلہ

اب میں مکہ مکرمہ کے کسی مدرسہ میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اپنے ایک حاجی کے پاس مکہ مکرمہ کے خیریہ عارفیہ نامی ایک مدرسہ کا کارڈ دیکھا۔ حاجیوں سے چندہ حاصل کرنے کی غرض سے یہ کارڈ حرم شریف کے دروازہ پر تقسیم کیا گیا تھا۔ میں اس کارڈ کے پتہ پر مذکورہ مدرسہ کے دفتر پہنچا۔ مدرسہ کے مدیر (ناظم) شیخ عارف علی نے مجھے حاجی سمجھ کر بڑے احترام سے استقبال کیا، تاکہ انہیں مدرسہ کے لیے کچھ چندہ مل جائے۔ آفس میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے کچھ پرائیویٹ بات کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ غور سے سنیں۔ وہ سننے کے لیے تیار ہو گئے تو میں یوں گویا ہوا:

میں دراصل ایک طالب علم ہوں۔ ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ ضلع اعظم گڑھ، شہر مئو کے مدرسہ فیض عام میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خیال ہوا کہ بقیہ تعلیم سعودی عرب میں مکمل کروں، چنانچہ میں اِدھر آ گیا۔ میں اِس وقت چاہتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں داخلہ لوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مزید گزارش یہ بھی ہے کہ آپ اپنے مدرسہ میں یا اپنے گھر یا اپنے محلہ میں روزانہ دو تین گھنٹہ کے لیے مجھے کوئی مناسب کام دلوا دیں تا کہ میں اس کی تنخواہ سے گزر اوقات کر سکوں۔

مدیر صاحب نے میری بات سننے کے بعد کہا: یہاں حکومت کی طرف سے سخت ممانعت ہے کہ کوئی شخص یا کوئی ادارہ کسی حاجی کو حج کے بعد اپنے یہاں رکھے، لیکن ہم آپ کا داخلہ اس

شرط پر کر سکتے ہیں اور مدرسہ میں کوئی کام بھی دے سکتے ہیں کہ اگر کوئی پولیس آپ سے دریافت کرے کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ حرم شریف میں درس سنتا ہوں اور حرم ہی میں رہتا ہوں۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، مجھے یہ شرط منظور ہے۔

میری درخواست بڑی آسانی سے منظور ہوگئی اور اس پر مجھے خوشی بھی ہوئی، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس منظوری میں خود مدیر صاحب کی کچھ مصلحتیں تھیں۔ پہلی مصلحت تو یہ کہ مدرسہ کا جو کام مجھے دیا گیا تھا اگر اس کے لیے کوئی سعودی یا یمنی نوکر رکھتے تو اس کو زیادہ تنخواہ دینی پڑتی جبکہ میں معمولی تنخواہ پر بھی کام کرنے پر مجبور تھا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ میرے داخلہ کی وجہ سے انہیں میرے اطراف کے حاجیوں سے زیادہ چندہ ملنے کی امید تھی۔ بہرحال، جو شخص بھی کوئی کام کرتا ہے کچھ نہ کچھ مصلحت سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ اگر میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے داخلہ لیا تھا اور انہوں نے مدرسہ کی کسی مصلحت کی وجہ سے منظور کیا تھا تو اسے کوئی برا نہیں کہا جا سکتا۔

چونکہ مدرسہ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد کھلنے والا تھا، اس لیے مدیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مدرسہ کھلنے تک مدرسہ کے دفتر میں تھوڑا بہت کام کرتے رہیں اور آپ کا کھانا پینا ہمارے ساتھ رہے گا۔ میرے لیے اس وقت یہی غنیمت تھا کہ جائے پناہ بھی مل جائے اور خورد و نوش کا بھی انتظام ہو جائے۔ میں نے خوشی خوشی دفتر میں کام شروع کر دیا اور اپنے حاجیوں کو رخصت کرنے کے بعد اپنا سامان ان کے یہاں سے لاکر مدرسہ خیریہ عارفیہ میں رکھ دیا۔

اب وہاں ماہ ذوالحجہ ختم ہونے ہی والا تھا، حاجی بھی کم ہونے لگے تھے، دفتر میں میرا صرف اتنا کام تھا کہ مدرسہ کے اشتہارات کی غلطیاں درست کر کے حاجیوں میں تقسیم کروں اور دفتر میں فروخت کے لیے جو کتابیں تھیں انہیں فروخت کرتا رہوں۔

وقت ہوتے ہی مدرسہ کھل گیا۔ یہ ابتدائیہ مدرسہ تھا۔ میں نے اس کی آخری کلاس یعنی چھٹی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ پڑھنے کے لیے مجھے مدرسہ کی طرف سے کتابیں مل گئیں۔ طلباء

میں اور خود مدیر کے لیے ان کے گھر میں، جو مدرسہ کی اوپری منزل میں رہتے کے لیے مدرسہ تھے، مٹی کے جیر یا بڑے مٹکے میں پینے کا پانی بھرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا جس کے عوض مجھے پینتالیس ریال ماہانہ ملنے لگے۔ دوسرا کام مجھے مدرسہ کی صفائی کا بھی دیا گیا اور میری مجموعی تنخواہ پچھتر ریال ماہانہ کردی گئی۔

مدیر مدرسہ شیخ عارف علی صاحب کا برتاؤ تو میرے ساتھ بہت اچھا رہا، لیکن دھیرے دھیرے جب ان کے عقیدے سے واقفیت ہوئی تو ان سے نفرت سی ہوگئی۔ عقیدہ وعمل کے اعتبار سے وہ ایک خرافی وبدعتی آدمی نکلے۔ ویسے تو بہت سے حنفی المسلک حضرات سے میرے تعلقات ہیں اور ان میں بہتوں کو معتدل بھی پایا، لیکن یہ شیخ عارف علی حنفی عقیدہ میں ناجائز حد تک غلو کرنے والے ثابت ہوئے۔

حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں مذاہب کے الگ الگ بنے ہوئے مصلے حرم کے مطاف کی توسیع کے ساتھ ساتھ توڑے جا رہے تھے، بلکہ حنبلی ومالکی مصلے مطاف کی پہلی توسیع ہی میں توڑے جاچکے تھے۔

اب حنفی مصلی توڑنے کی نوبت آئی تو مذکورہ بالا مدرسہ کے مدیر شیخ عارف علی صاحب ایک روز بڑے دردمندانہ انداز میں مجھ سے کہنے لگے کہ عطاء الرحمن! اور جانتے ہو!! معلوم ہوا کہ اب حنفی مصلی بھی توڑ دیا جائے گا!! جب حنفی مصلی ہی توڑ دیا جائے گا تو خانۂ کعبہ کے رہنے سے کیا فائدہ؟ اسے بھی توڑ دیں!! میں ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گیا، معاذ اللہ!! یہ ہے ان کی مسلمانی!! گویا حنفی مصلی کے سامنے خانۂ کعبہ کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ ان کی یہ باتیں سن کر مجھے بہت دکھ ہوا لیکن انہیں کچھ کہہ نہ سکا۔

ایک روز مدیر صاحب مجھے کسی کے یہاں دعوت میں ساتھ لے گئے۔ میزبان کے یہاں پہنچ کر کچھ دیر بعد قرآن مجید منگوا کر پڑھتے رہے، پھر میزبان سے اس کے کسی رشتہ دار کا، جو انتقال کرچکے تھے، نام پوچھا اور عربی میں کچھ ایسے الفاظ بولتے رہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ میں اس میت کی نماز اپنے ذمہ لیتا ہوں، اے اللہ تو اسے بخش دے۔ پھر اس کے بعد

قرآن مجید کو چوما اور وہاں موجود مہمان ومیزبان سبھی ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے لگے۔ مجھے یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی اور میں ان کی دعا میں شریک نہیں ہوا۔ وہ لوگ دعا کرتے تھے اور کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتے تھے، لیکن میں خاموش بیٹھا رہا۔ شیخ عارف میری نماز ودیگر معمول دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ میں حنفی العقیدہ نہیں ہوں۔ وہ مجھے شافعی یا حنبلی سمجھ رہے تھے یا انگریز کی ایجاد کردہ اصطلاح میں وہ مجھے وہابی سمجھ رہے تھے اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے دعا میں میری عدم شرکت پر کوئی اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کی۔

بہرحال یہ دو واقعات ایسے تھے جن کی وجہ سے ''الحب في الله والبغض في الله'' کے اصول کے مطابق فطری طور پر مجھے ان سے نفرت ہوگئی تھی، لیکن مدیر المدرسہ اور معمر آدمی ہونے کی وجہ سے میں مذکورہ دونوں حرکتوں میں سے کسی پر بھی انہیں ٹوک نہیں سکا، جسے میں اپنے ایمان کی کمزوری سمجھتا ہوں۔

اگرچہ میں ابتدائیہ مدرسہ کی آخری کلاس میں داخلہ لے کر پڑھنے لگا تھا، لیکن میرا تعلیمی معیار اس سے کہیں اونچا تھا۔ اگر متوسطہ کی آخری کلاس یا ثانویہ کی پہلی کلاس میں داخلہ ہوتا تو مجھے اطمینان رہتا، لیکن سرکاری مدرسہ کے متوسطہ میں داخلہ کے لیے ابتدائیہ کی سرٹیفکٹ ہونی چاہیے تھی اور ثانویہ میں داخلہ کے لیے متوسطہ کی سرٹیفکٹ، نیز سرکاری اقامتی پرمیشن کی بھی ضرورت تھی اور میرے پاس ایسی کوئی سرٹیفکٹ وسرکاری اقامتی اجازت نہیں تھی، لہٰذا میں ابتدائیہ کی آخری کلاس کے علاوہ کسی اوپر کلاس میں داخلہ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے وہاں باقاعدہ سرکاری اقامتی پرمیشن حاصل کرنے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت تھی، اس لیے میں نے مکہ مکرمہ پہنچنے کے تین چار ماہ بعد ایک روز جدہ جا کر ہندوستانی سفارت خانے میں پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی اور وہاں سے اس مضمون کی ایک سرٹیفکٹ حاصل کرلی کہ (اس کے پاسپورٹ کا معاملہ سفارت خانے میں چل رہا ہے) تاکہ جدہ مکہ جانے آنے میں پولیس کی تفتیش کے وقت پریشانی نہ ہو۔

بہرحال میرا ابتدائیہ میں پڑھنے کا مقصد صرف سرٹیفکٹ کے لیے وقت گزاری کرنا تھا۔ میں اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے معیاری تعلیم کی تلاش میں رہا۔ کچھ روز مکہ مکرمہ میں رہنے کے بعد وہاں کے نشیب وفراز سے واقفیت ہونے لگی۔ وہاں کے لوگوں سے تعارف بھی ہونے لگا۔ وہاں کے اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے تعلق پیدا ہوا اور مکہ مکرمہ میں موجود دیگر مدارس سے بھی واقفیت ہوئی۔

مدرسہ دارالحدیث مکہ مکرمہ میں داخلہ

میں مکہ مکرمہ میں تین چار ماہ گزارتے ہی مدرسہ دارالحدیث سے واقف ہوگیا تھا، جہاں ہندوستانی درس نظامیہ کے طرز پر تعلیم ہورہی تھی۔ یہ مدرسہ ہندوستانی جماعت اہل حدیث کا سعودی عرب میں قائم کردہ دوسرا مدرسہ تھا جب کہ مدینہ منورہ میں اسی جماعت کا قائم کردہ ایک اور مدرسہ دارالحدیث ہی کے نام سے چل رہا تھا، جس کے قائم کرنے میں خاص کر دہلی کے اہل حدیث جناب حافظ حمیداللہ صاحب (رحمہ اللہ) نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، بلکہ مالی اخراجات خود انہی نے برداشت کیے تھے۔ یہ دارالحدیث آج بھی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ماتحت اسلامی علوم کے فروغ دینے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔

جب میں نے مکہ مکرمہ کے دارالحدیث میں داخلہ لیا تھا تو شیخ عمر افریقی اس کے مدیر تھے اور اس میں عربی اساتذہ کے ساتھ ساتھ دو ہندوستانی اساتذہ بھی تعلیم دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک تھے شیخ عبدالحق ہاشمی جو بہاولپور کے رہنے والے تھے اور دوسرے لکھنؤ کے شیخ ابوسعید عبداللہ تھے۔ یہ لوگ بہت دنوں سے مکہ مکرمہ میں رہ رہے تھے اور سعودی عرب کی شہریت بھی حاصل کرچکے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے رابطہ قائم کرکے اس مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ میں ہندوستان اعظم گڑھ کے مدرسہ فیض عام مئو میں حدیث کی کتاب مشکوٰۃ المصابیح، قواعد میں شرح ملا جامی، بلاغت میں تلخیص المفتاح، مختصر المعانی اور منطق میں قطبی وسلم العلوم پڑھ چکا تھا۔ اب مکہ مکرمہ کے اس مدرسہ میں ترمذی، بخاری ومسلم اور قواعد میں قطر الندی پڑھنے لگا۔

محترم استاذ شیخ ابوسعید عبداللہ (رحمہ اللہ) سے میرا زیادہ لگاؤ رہا۔ دارالحدیث میں

داخلہ لینے کے بعد کچھ روز ان کے گھر میں رہ کر ان کی خدمت کرتا رہا۔ پھر دارالحدیث ہی میں مستقل طور پر قیام کی اجازت لے لی۔ پہلا مدرسہ خیریہ عارفیہ کے مدیر سے بھی اجازت لے لی تھی کہ ابتدائیہ کی پڑھائی میرے لیے بہت معمولی ہے، اس لیے میں یہاں کلاس میں شرکت کرنے کے بجائے مدرسہ دارالحدیث میں حدیث کی کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں اور آپ کے ابتدائیہ مدرسہ کے صرف سالانہ امتحان میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مدرسہ کے کام کا تعلق ہے تو وہ میں وقت پر حسب معمول کرتا رہوں گا۔ انہوں نے اس پر موافقت کی اور دارالحدیث میں میری باقاعدہ پڑھائی شروع ہوگئی۔ جب ابتدائیہ کے سالانہ امتحان کا وقت آ گیا تو اس میں شرکت کر کے ابتدائیہ کی سرکاری سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لی۔

حج وعمرہ

جب مکہ مکرمہ پہنچا تھا تو اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوسکوں، لہٰذا میں مکہ مکرمہ داخل ہوتے وقت عمرہ کی نیت واحرام کے بغیر داخل ہوا تھا، لیکن اب جب کہ مکہ مکرمہ میں کچھ مدت گزار کر ہر طرف سے قدرے اطمینان ہوگیا تو مقامِ تنعیم سے، جو حدودِ حرم سے باہر ہے، عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھ آیا اور کعبہ شریف کا طواف اور صفاومروہ کی سعی کر کے اپنا فوت شدہ عمرہ پورا کرلیا۔

اگر پہلے سے حج وعمرہ کے بارے میں ضروری جانکاری ہوتی تو میں عمرہ کا احرام باندھنے کے لیے مقامِ تنعیم یا حدودحرم سے باہر نہیں جاتا، کیوں کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں حج وعمرہ کرنے والوں کے لیے میقات (حج یا عمرہ کی نیت کر کے احرام باندھنے کے مقام) کی تعیین کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ اہل مدینہ کا میقات ذوالحلیفہ (موجودہ بئرعلی)، اہل شام کا میقات جحفہ (موجودہ رابغ)، اہل نجد کا میقات قرنِ منازل اور اہل یمن کا میقات یلملم ہے۔ یہ مواقیت مذکورہ اطراف کے لوگوں کے لیے ہیں اور یہی مواقیت ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو حج یا عمرہ کی نیت کر کے ان مقامات سے گزریں، البتہ جو لوگ ان مقامات کے اندر ہیں وہ لوگ جس جگہ ہیں اسی جگہ سے احرام باندھیں گے جہاں سے وہ حج یا عمرہ کی نیت کریں گے، یہاں تک کہ اہل مکہ میں سے جو لوگ حج یا عمرہ کا ارادہ کریں گے وہ مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔

اب چونکہ میں غیر معلوم مدت کے لیے مکہ مکرمہ میں مقیم ہو کر اہل مکہ کے حکم میں داخل ہو چکا تھا، اس لیے میں نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران پہلے عمرہ کے علاوہ جو حج یا عمرہ کیا اس کے لیے مکہ مکرمہ ہی سے اِحرام باندھتا رہا۔

غارِ حراء

مکہ مکرمہ کے شمال مشرق میں ایک پہاڑ ہے جسے جبل حراء یعنی حراء پہاڑ کہا جاتا ہے اور بعد میں اسے جبل نور (کوہِ نور) کہا جانے لگا۔ اسی پہاڑ پر ایک غار ہے جو غار حراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وہ تاریخی غار ہے جہاں رسولِ خدا محمد ﷺ مشرف بالنبوت ہونے سے قبل، اللہ کی یاد و عبادت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ پانی و ستو بھی لے جایا کرتے تھے اور وہاں دو دو، تین تین روز رہ کر ذکر و فکر میں گزار کر واپس آتے تھے۔ کبھی کبھی خدیجہ (رضی اللہ عنہا) بھی ساتھ جاتی تھیں اور رسول اللہ ﷺ کو جبل حراء کے قریب چھوڑ آتی تھیں۔ یہی وہ تاریخی غار ہے جہاں جبریل علیہ السلام نے محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارتِ نبوی سنائی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں اللہ کا فرشتہ جبریل ہوں۔ یہاں جبریل علیہ السلام اپنی اصلی ہیبت ناک آفاقی شکل میں بھی رسول اللہ ﷺ کو نظر آئے تھے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ انوکھا واقعہ تھا، لہٰذا دل میں گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ آپ غارِ حراء سے گھر واپس آ کر لیٹ گئے اور اپنی بیوی خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھ پر چادر ڈال دو۔ جب طبیعت میں ذرا سکون ہوا تو بیوی سے فرمایا کہ میں نے اس قسم کا واقعہ دیکھا جس سے مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نہیں، آپ کو ڈر کس چیز کا ہے! میں دیکھتی ہوں کہ آپ اقرباء پر شفقت فرماتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیواؤں، یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور مصیبت زدوں سے ہمدردی فرماتے ہیں۔ خدا آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔

اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود بھی اطمینانِ قلب کی ضرورت محسوس کی اور نبی کریم ﷺ کو ساتھ

لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو ایک عیسائی موحد و خدا پرست عالم بھی تھے۔ اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کے پاس پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ورقہ کو اپنا واقعہ سنائیں۔ آپ نے ورقہ بن نوفل کو جبریل کے آنے اور بات کرنے کا واقعہ بیان فرمایا۔ یہ سنتے ہی ورقہ بن نوفل بول پڑے کہ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو مکہ سے نکال دے گی!!

اس پیشین گوئی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کہ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ ورقہ نے جواب دیا کہ ہاں...... اس دنیا میں جب بھی کسی نے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچایا اس سے شروع میں عداوت ہی ہوتی رہی۔ کاش میں آپ کی ہجرت تک زندہ رہتا اور آپ کی بھرپور مدد کر پاتا!

پھر کچھ دن بعد جبریل علیہ السلام اسی غارِ حراء میں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیات پڑھائیں:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ. الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

''پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا کیا۔ (اور) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو اور (یہ یقین رکھو کہ) تمہارا پالنہار بہت کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ چیزیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔ [قرآن کریم سورۃ علق: ۹۶/۱-۵]

چونکہ ان آیات کا پہلا لفظ ''اقرأ'' ہے جس کے معنی ہیں ''پڑھ'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کے سنتے ہی کہا ہے کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا، اس پر جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کو اپنے سینے سے لگا کر قدرے دبایا اس کے بعد پھر سے ان آیات کو ''اقرأ'' سے شروع کیا۔ اس بار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ پھر جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کو اپنے سینے سے ملا کر قدرے بھینچا اور وہی آیات پڑھانے کی کوشش کی، پھر جواب

وہی رہا تو تیسری بار بھینچا۔ اس بار رسول اللہ ﷺ اسی طرح پڑھنے لگے جس طرح جبریل علیہ السلام پڑھتے گئے۔

اس کے بعد اسی غار کے پاس جبریل علیہ السلام نے وضو کیا اور ان کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح وضو کیا، پھر دونوں نے مل کر نماز پڑھی اور اس نماز کی امامت جبریل علیہ السلام نے فرمائی۔

چونکہ اس غار سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہوئی تھی، اس لیے ہر مسلمان کے دل میں اس غار کے ساتھ والہانہ تعلق پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ میں نے بھی اپنے دل میں اس غار کے ساتھ ایسا ہی لگاؤ محسوس کیا اور اسے دیکھنے کے شوق میں ایک روز کچھ احباب کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنا لیا پھر ہم چند احباب کا قافلہ حسب پروگرام جبل نور کی طرف چل پڑا۔

حرم شریف سے وہاں کی مسافت کوئی ڈیڑھ دو کیلو میٹر رہی ہوگی۔ بسم اللہ کہہ کر ہم اس پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ راستہ قدرے دشوار بھی محسوس ہوا جسے طے کر کے غار تک پہنچنا کمزور آدمی کے لیے مشکل تھا۔ ہمارے قافلے میں اکثر جوان آدمی تھے۔ اللہ کے فضل سے ہم وہاں پہنچ گئے اور عقیدت مندانہ تصور کے ساتھ اس غار میں کچھ دیر بیٹھے۔ پھر اس کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ غار اس پہاڑ کی لگ بھگ دو تہائی اونچائی پر واقع ہے۔ یہ غالباً اس پہاڑ کے مغربی کنارے پر دیوار نما اونچے پتھر کے ٹیلے کے مغربی بازو میں پتھر کے اندر گھسی ہوئی تھوڑی سی خالی جگہ پر مشتمل ہے اور اس کے متصل مغرب میں بھی پتھر کا ایک چھوٹا لمبا ٹکڑا پڑا ہوا ہے، جہاں براہِ راست دھوپ نہیں پہنچتی، لہٰذا گرمی کے زمانے میں بھی وہاں اطمینان بخش ٹھنڈک رہتی ہے۔

غار دیکھ کر ہم واپس آئے، لیکن اس کے بعد بھی حج کے موسم میں اپنے اطراف کے کچھ حاجیوں کے اِصرار پر انہیں وہ غار دکھانے کے لیے پھر ایک بار مجھے وہاں جانا پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں حاجی لوگ جا کر طرح طرح کے خرافاتی رسم ورواج کا ارتکاب کرتے تھے، اس لیے سعودی حکومت نے حاجیوں کے وہاں جانے پر پابندی لگا دی ہے۔

غارِ ثور

یہ غار جبل ثور نامی پہاڑ پر ہے جو مکہ مکرمہ کے جنوب میں تقریباً چار پانچ کیلومیٹر دوری پر واقع ہے۔ یہ وہ غار ہے جہاں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہجرت کی غرض سے اپنے گھر چھوڑ کر تین دن اور چار راتیں روپوش رہے۔

کفارِ قریش کا ظلم وستم حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے کچھ مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے ملک حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی تھی، وہاں کا بادشاہ ایک رحمدل عیسائی تھا۔ ان کا نام نجاشی تھا اور وہ بعد میں مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ جو مسلمان حبشہ ہجرت نہ کر پائے تھے انہیں آپ نے بعد میں یثرب (مدینہ منورہ) ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، لیکن رسول اللہ ﷺ کو خود اپنی ہجرت کے لیے اللہ کے حکم کا انتظار تھا۔

سنہ ۱۴ نبوی ماہ صفر کے آخری ایام میں رسول اللہ ﷺ کو بھی یثرب (مدینہ منورہ) ہجرت کرنے کا حکم مل گیا۔ اُدھر کفارِ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش تیار کر لی تھی۔ انہوں نے جس رات اپنی سازش پر عمل کرنا چاہا اتفاق سے اسی رات ہجرت کے لیے رسول اللہ ﷺ کو گھر چھوڑنے کا حکم ہو گیا تھا۔ رؤسائے قریش نے تمام قبائل کے چیدہ چیدہ جوانوں کے ایک مسلح دستہ کو حکم دے دیا تھا کہ جمعرات کی شام کو آفتاب غروب ہونے کے بعد اندھیرا پھیلتے ہی رسول اللہ ﷺ کے گھر کا گھیراؤ کر لیں اور آدھی رات کے بعد گھر کے اندر گھس کر سب لوگ ایک ساتھ تلوار کا وار کر کے رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں۔ اس طرح قتل میں تمام عرب قبیلے شریک ہو جائیں گے اور ہاشمی خاندان محمد (ﷺ) کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سارے عرب قبائل سے لڑنے کی ہمت نہیں کریں گے، تاہم اگر وہ لوگ آپ کا خون بہا یعنی

دیت کا مطالبہ کریں تو سارے قبیلے مل کر دیت ادا کر دیں گے۔

اِدھر رسول اللہ ﷺ ۲۷ صفر جمعرات کے دن دوپہر کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جا کر ہجرت کا پروگرام طے کر چکے تھے۔ واپس آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شام کے وقت ہی بتا دیا تھا کہ آج رات تم میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو جانا اور میرے جانے کے بعد وہ ساری امانتیں واپس کر دینا جو لوگوں نے میرے گھر رکھی ہیں۔ ان شاء اللہ، کفار تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم ان امانتوں سے نمٹنے کے بعد ہجرت کر کے یثرب پہنچ جانا۔

جمعرات ۲۷ صفر ۱۲ ستمبر سنہ ۶۲۲م کا سورج غروب ہو کر اندھیرا پھیلتے ہی کفارِ قریش کا مسلح دستہ رسول اللہ ﷺ کے گھر کا گھیراؤ کر چکا تھا۔ اسی رات یعنی جمعہ کی رات مورخہ ۲۸ صفر سنہ ۱۴ نبوی مطابق ۱۳ ستمبر سنہ ۶۲۲ میلادی آدھی رات کے بعد رسول اللہ ﷺ بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکلے اور سورۂ یاسین کی آیت ﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ پڑھتے ہوئے زمین سے ایک مٹھی مٹی لے کر گھیراؤ دستہ پر چھڑکتے ہوئے مسلح دستہ کے بیچ سے صحیح سالم نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان گھیراؤ کرنے والے دشمنوں کی آنکھوں پر ایسا پردہ حائل کر دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ بھی نہ سکے اور مٹی کا چھڑکاؤ ہوتے ہی ان پر نیند کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ وہ جہاں تھے وہیں پڑے رہے۔

رسول اللہ ﷺ دشمنوں کے نرغے سے نکل کر سیدھا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے اور وہاں سے انہیں ساتھ لے کر طے شدہ پروگرام کے مطابق دونوں رات کے اندھیرے میں مکہ مکرمہ سے نکل گئے اور جمعہ کی صبح ہونے تک وہ دونوں جبل ثور تک پہنچ گئے۔

جب ثور پہنچ کر وہاں تین روز روپوش رہنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ و حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو غار منتخب فرمایا تھا وہی غار ''غارِ ثور'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے تنہا اس غار میں گھس کر اس کے فرش و دیوار میں موجود چند سوراخیں اپنا کپڑا پھاڑ کر بند کر دیے۔ مزید پھاڑنے کے قابل کپڑا نہ رہنے کی وجہ سے دو ایک سوراخ باقی رہ گیا جس کے منہ پر انہوں نے خود اپنا قدم رکھ کر بند کر دیا، پھر رسول اللہ ﷺ کو اندر بلا کر

بٹھایا۔ کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زانو پر اپنا سر رکھ کر لیٹ گئے اور آپ کو نیند آ گئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار کے جس سوراخ کے منہ پر اپنا قدم رکھ کر بند کیے ہوئے تھے اسی سوراخ سے ایک زہریلے بچھو نے ان کے پاؤں میں یکے بعد دیگرے کئی ڈنگ مارے۔ اس بچھو کی پہلی ہی ڈنک پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو جگا سکتے تھے یا مزید ڈنک سے بچنے کے لیے وہ اپنا پاؤں اس سوراخ کے منہ سے ہٹا سکتے تھے، لیکن اس اندیشہ کی بنا پر انہوں نے اس سوارخ کے منہ سے اپنا قدم نہیں ہٹایا کہ کہیں یہ زہریلا بچھو نکل کر رسول اللہ ﷺ کو نقصان نہ پہنچادے اور اس خیال سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں جگایا کہ آپ کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑے۔

زہریلے بچھو کے ڈنک سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ جب شدت تکلیف سے آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر گرے تو رسول اللہ ﷺ جاگ گئے اور آنسو گرنے کا سبب دریافت فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اس سوراخ سے کسی بچھو نے میرے پاؤں میں ڈنک ماری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے کیوں نہیں جگایا؟ اس پر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے پسند نہیں آیا کہ میں آپ کی نیند میں کوئی خلل ڈالوں۔ تب آپ ﷺ نے اُٹھ کر اپنا لعاب (تھوک) مبارک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زخم پر لگا دیا۔ اللہ کے فضل سے لعاب نے فوراً اثر کیا اور زہریلی ڈنک کی تکلیف کافور ہوگئی، پھر صادق وصدیق دونوں وہاں آرام فرمانے لگے۔

اُدھر کفارِ قریش کے مسلح دستہ کی صبح صبح آنکھیں کھلیں تو وہ اپنی غنودگی پر نادم ہوئے اور سب مل کر رسول اللہ ﷺ کے گھر کے اندر گھس گئے، لیکن گھر میں انہیں رسول اللہ ﷺ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نظر آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ محمد (ﷺ) کہاں ہیں؟ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے کیا خبر، تم لوگوں نے میرا پہرا کیا اور انہیں نکل جانے دیا۔ اس جواب کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جا کر ان کی لڑکی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ

تمہارے ابا کہاں ہیں؟ لڑکی نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس پر بے رحم ملعون نے اسماء رضی اللہ عنہا کے گال پر ایک طمانچہ بھی مارا جس سے اسماء کے کان کی بالی ٹوٹ کر گر پڑی۔ جب رسول اللہ ﷺ وابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں میں سے کوئی بھی گھر میں نہیں ملا تو وہ لوگ اِدھر اُدھر گلی کوچے اور پہاڑوں کے دامنوں میں انہیں تلاش کرنے نکل گئے اور اتفاق سے کچھ لوگ انہیں تلاش کرتے ہوئے جبل ثور بھی پہنچ گئے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنے والے دشمنوں کی آواز اوران کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی غمگین انداز میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ کچھ لوگ ہماری طرف آتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر وہ لوگ یہاں سے گزرتے ہوئے اپنے قدموں کی طرف نظر کریں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلایا کہ غمگین نہ ہونا، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس واقعہ کو قرآن کریم نے اِن الفاظ میں بیان کیا ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (توبہ:۹/۳۹) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے ہی سے راسخ الایمان شخص تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے ''صدیق'' کا لقب پایا، رسول اللہ ﷺ کی اس تسلی سے مطمئن ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور صاحب رسول کو کفارِ قریش کی نظروں سے بچانے کے لیے ان کی آنکھوں پر باطنی پردہ ڈال ہی چکا تھا، ساتھ ہی اس غار میں کسی کی موجودگی کے اِحساس پر پردہ ڈالنے کے لیے اُس غار کے دہانے پر کچھ ظاہری اسباب بھی مہیا کردیے۔ جس غار کے اندر یہ صاحبین آرام فرماتے تھے اس کا منہ قدرے تنگ تھا اور کنارے سے دہانے کی طرف نکلا ہوا پتھر کے سرے پر اللہ کے حکم سے صبح صبح کسی کبوتری نے گھونسلا بنا کر انڈے بھی دے دیے تھے، تاکہ کسی بھی دیکھنے والے کو یہ یقین ہوجائے کہ اِس غار میں آج کل کوئی داخل نہیں ہوا، کیوں کہ اگر آج رات یا صبح اس غار کے اندر کوئی گیا ہوتا تو اس غار کے منہ پر گھونسلا باقی نہ رہتا اور یہ انڈے بھی اس حالت میں باقی نہ رہتے۔

کفارِ قریش کے چند افراد اُس غار کے قریب پہنچ چکے تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ وابوبکر رضی اللہ عنہ غار کے اندر سے دیکھ بھی رہے تھے اور ان تلاش کرنے والوں میں سے بعض افراد

نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے وہ دونوں اس غار میں چھپے ہوئے ہوں۔ لیکن دیگر لوگوں نے غار کے دہانے پر کبوتر کا گھونسلا اور انڈا دیکھ کر یقین کر لیا کہ اس میں کوئی نہیں ہے۔ آخر تلاش کرنے والے غار کے نو وارد مکینوں کو نہیں دیکھ پائے اور وہاں سے ناکام واپس گئے۔

طے شدہ پروگرام و ہدایت کے مطابق عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ شہر میں کفار کے دن بھر کی خبریں معلوم کر کے شام تک رسول اللہ ﷺ کو بتا دیتے تھے اور اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا رات کے اندھیرے میں کچھ کھانے پینے کے سامان غار میں پہنچاتیں اور یہ دونوں بھائی بہن رات ہی رات اندھیرے میں گھر واپس چلے جاتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کا غلام عامر بن فہیرہ، جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بکریاں چرانے اور دیکھ ریکھ کرنے پر مامور تھے، بکریوں کا ریوڑ لے کر صبح اسی راستے سے نکل جاتے تھے جس راستے سے عبداللہ بن ابی بکر و اسماء رضی اللہ عنہا کھانا و خبریں لے کر غار کی طرف جایا آیا کرتے تھے تاکہ ان کے قدموں کے نشانات مٹ جائیں۔

رسول اللہ ﷺ و ابو بکر رضی اللہ عنہ غار میں تین راتیں اور تین دن گزار چکے تھے۔ ماہِ صفر (عربی مہینوں کی ترتیب سے دوسرے مہینے) کی ۳۰ تاریخ اتوار کا سورج غروب ہوتے ہی یکم ربیع الاول کی رات بھی سایہ فگن ہو گئی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق چوتھی رات کو عامر بن فہیرہ مع راستہ دکھانے والا ملازم عبداللہ بن اُریقط دو اونٹنیاں لے کر غار ثور پہنچ گئے۔ ایک پر رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دوسری پر عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اُریقط سوار ہو گئے۔ اسماء رضی اللہ عنہا بھی زادِ راہ دینے کے لیے پہنچ چکی تھیں، لیکن وہ اونٹ کے ساتھ لٹکانے کے لیے کوئی رسی لانا بھول گئی تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنے کمر بند کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے اس زادِ راہ کو اونٹ کے ساتھ باندھ دیا جس کی وجہ سے وہ "ذات النطاقین" لقب پائیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنا یہ چھوٹا سا قافلہ لے کر پیر کی رات کو بتاریخ یکم ربیع الاول سنہ ایک ہجری مطابق ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء غار ثور چھوڑ کر پہلے یمن کی طرف کچھ دو چل کر رُخ بدل کے عام راستہ کے بجائے غیر مستعمل ساحلی راستہ سے یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف چلنے لگے اور پیر کی صبح سورج طلوع ہونے تک کافی دور نکل گئے۔

یہ غارِ ثور بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی مراحل سے متعلق اُن تاریخی مقامات میں سے ایک ہے جنہیں مسلمان کبھی بھول نہیں سکتے۔ ایک روز چند ساتھیوں کے ہمراہ میں نے جبل ثور کے اوپر جا کر اس غار کو بھی دیکھا اور دوسرے سال اپنے اطراف سے حج کے لیے پہنچے ہوئے حاجیوں کے ایک قافلہ کو بھی دکھا لایا۔ اس تاریخی غار کی رؤیت کے شوق سے سرشار کئی ایسے حاجی صاحبان جو قدرے معمر تھے، پیدل چلنے اور پہاڑ پر چڑھ سکنے کی پوری ہمت ظاہر کرتے ہوئے ہمارے قافلے میں شامل ہو گئے۔ میں نے انہیں اس لیے روکنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں ان کے اشتیاق بھرے دل کو ٹھیس نہ لگے۔

ہم صبح سویرے ہی جبل ثور کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن یہ معمر حاجی صاحبان غار تک پہنچتے پہنچتے بہت زیادہ تھک گئے اور اس پہاڑ سے اترتے وقت تو وہ دوسروں کے سہارے کے بھی محتاج ہو گئے۔ کسی کو میں نے خود سہارا دیا اور کسی کو قافلہ کے دیگر جوانوں کے حوالہ کیا، تاہم پہاڑ سے اترتے اترتے وہ لوگ اتنے تھک گئے کہ اب وہ ہموار زمین پر آنے کے بعد بھی بلا سہارا چلنے سے قاصر تھے۔ اگر ہم راستے کے کنارے کہیں بیٹھ کر کچھ ستا لیتے تو سورج کی بڑھتی ہوئی تپش سے گرمی بڑھتی جاتی اور قافلہ کو ساتھ لے کر چلنا مزید دشوار ہو جاتا، چنانچہ کہیں رکے بغیر ہم دھیرے دھیرے شہر کی طرف چلتے رہے۔ چلنے سے قاصر حاجیوں کو اپنے اور دیگر جوانوں کے کندھے پکڑا دیے اور اس طرح قافلہ کو ان کے ڈیرے پر پہنچا کر مجھے چھٹکارا ملا، پھر اس سلسلے میں اور کسی قافلہ کا ساتھ نہیں دیا۔

المعہد العلمی

ریاض میں داخلہ

مکہ مکرمہ میں گیارہ ماہ گزر گئے۔ اس کے بعد حج کا موسم آ گیا۔ حج سے فارغ ہوتے ہی سعودی عرب کی راجدھانی ریاض جا کر وہاں کے ایک مشہور دینی تعلیمی ادارہ ''المعہد العلمی'' میں داخلہ لینے کا پروگرام بنایا۔ یہ وہی ''المعہد العلمی'' ہے جس کے بارے میں ہندوستان کے مدرسہ فیض عام مئو میں پڑھتے وقت ہی کسی قدر جانکاری ہو چکی تھی اور فیض عام مئو کے چند احباب کے ساتھ اس میں داخلہ کی منظوری کے لیے ہم لوگوں نے مشترکہ کوششیں بھی کی تھیں، جس کا تفصیلی ذکر شروع میں ''ہماری مشترکہ تمنائیں اور مشترکہ جدوجہد'' عنوان کے تحت آ چکا ہے۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد پھر انہی کوششوں کی تکمیل کے درپے ہوا۔ ہندوستان مرشد آباد کے ایک طالب علم جناب نصرۃ اللہ صاحب غالباً مجھ سے دو سال قبل مکہ مکرمہ پہنچے ہوئے تھے اور وہاں کے ایک رباط (خیراتی مسافر خانہ) میں رہ کر حرم مکی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان سے بہت دیر میں میرا تعارف ہوا۔ ریاض جانے اور المعہد العلمی میں داخلہ لینے کے سلسلے میں ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے آتے وقت راستے میں پولیس چیکنگ ہوتی رہتی ہے اور غیر ملکی مسافر کے پاس اقامہ یعنی ٹھہرنے کا پرمیشن یا ویزا نہ ہونے پر پکڑ بھی لیتے ہیں، تاہم یہاں کے فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ کا سفارشی ورقہ لے کر جانے آنے والے کو سعودی پولیس نہیں روکتی۔ جناب نصرۃ اللہ صاحب سے یہ بھی معلوم

ہوا کہ شیخ ابن باز مکہ مکرمہ میں حج کا موسم ختم ہونے قیام کرتے ہیں اور اسی موقع پر ان سے مل کر سفارشی ورقہ لیا جاسکتا ہے۔

ماہِ ذی الحجہ کے اواخر میں ایک روز نصرۃ اللہ صاحب کے ساتھ شیخ ابن باز حفظہ اللہ سے ملنے گیا۔ نصرۃ اللہ صاحب خود اہل حدیث ہیں اور انہوں نے شیخ ابن باز سے میرا تعارف بھی اہل حدیث کی حیثیت سے کرایا اور المعہد العلمی میں داخلہ کے ارادے سے ریاض جانے کے راستے کے لیے ایک سفارشی ورقہ کی ضرورت کا ذکر کیا۔ شیخ ابن باز نے راستہ کے لیے ایک ورقہ لکھ دیا اور ساتھ ہی انہوں نے اپنی طرف سے ایک اضافی ورقہ بھی ریاض کے شیخ ابن سنان حفظہ اللہ کے نام لکھ دیا کہ یہ اہل حدیث طالب علم ہے، تحصیل علم کے لیے المعہد العلمی میں داخلہ لینا چاہتا ہے، آپ اس کا ہر ممکن تعاون فرمائیں وغیرہ۔

عرب پہنچنے کے بعد کسی عرب شیخ کی مجلس میں بیٹھنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ شیخ ابن باز کی اس مجلس میں پہلی بار مجھے عربی قہوہ (کافی) پینے کا موقع ملا۔ عرب مجلس میں چائے سے قبل قہوہ کا دور چلتا ہے۔ یہاں کی مجلس میں قہوہ پلانے کا انداز بھی نرالا ہے، قہوہ کے لیے بہت چھوٹی چینی یا تام چینی کی پیالی کا استعمال کرتے ہیں، جس کی ساخت ہندوستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر چائے کے لیے استعمال ہونے والی مٹی کی سب سے چھوٹی پیالی کے مشابہ ہوتی ہے، جس میں بمشکل دو تین گھونٹ قہوہ آسکتا ہے، لیکن عام طور پر پیالی بھر کر قہوہ نہیں دیا جاتا، گویا پیالی بھر کے قہوہ دینا قہوہ نوشی کے آداب کے خلاف ہے۔ بہر حال، جب قہوجی (یعنی قہوہ پلانے والا) ایک طرف سے قہوہ دیتے ہوئے میرے پاس آیا تو میں نے بھی اپنی پیالی تھام لی۔ اس چھوٹی سی پیالی میں آدھی پیالی قہوہ دیکھ کر ایک نیا آدمی یہی سمجھے گا کہ شاید قہوہ تھوڑا ہے اس لیے سب کو آدھی آدھی پیالی قہوہ دیا جارہا ہے، لیکن یہ بار بار دیتا ہے اور کسی بار بھی پیالی بھر کے نہیں دیتا۔

مجھے چونکہ پہلی بار قہوہ پینے کا اتفاق ہوا اس لیے اس کے ذائقہ سے واقف نہ تھا۔ جب بسم اللہ کہہ کر پینا شروع کیا تو وہ قدرے ذائقہ دار ہونے کے باوجود مجھے ہلکا ہلکا کڑوا لگ رہا

تھا۔ میں نے بادلِ نخواستہ کئی چسکیاں لگا کر اپنی پیالی خالی کی اور اسے قہوجی کو واپس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا "بس"، لیکن اس نے پھر پیالی میں قہوہ ڈال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں شرما کر انکار نہیں کر سکا اور پیالی ہاتھ میں لے کر زبردستی پینے کی کوشش کی۔ اب کی بار دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹی چھوٹی کڑوی گھونٹ حلق سے اتارتا رہا اور کسی طرح قہوہ ختم کرکے پیالی واپس کرنے کے انتظار میں رہا۔ اب جوں ہی قہوجی سامنے آیا میں نے اسے پیالی واپس کرتے ہوئے پھر زبان سے کہا "بس"، لیکن اس اللہ کے بندے نے پھر مجھ پر زیادتی کر دی، اس نے پھر سے پیالی میں قہوہ ڈال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس بار بھی میں انکار نہیں کر سکا اور پیالی پکڑ لی۔

اب پیالی ہاتھ میں لے کر سوچتا رہا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مجلس کے کچھ لوگ قہوہ پینے کا سلسلہ ختم کرتے جا رہے تھے، لیکن یہ قہوجی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ دائیں بائیں نظر بچا کر غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ جو شخص پیالی واپس کرتے وقت نفی میں پیالی ہلا کر واپس کرتا ہے قہوجی اس کی پیالی میں دوبارہ قہوہ نہیں ڈالتا اور جو اپنی پیالی ہلائے بغیر واپس کرتا ہے قہوجی اس کی پیالی میں پھر سے قہوہ ڈالنے لگتا ہے۔ اب مجھے قہوہ کا سلسلہ ختم کرنے کی ترکیب معلوم ہوگئی۔ میں نے زبردستی چند گھونٹوں میں قہوہ حلق سے نیچے اتارا اور پیالی ہلا کر قہوجی کو واپس کر دیا۔ اب کی بار وہ خاموشی سے پیالی لے کر آگے بڑھ گیا اور مجھے اس مجلس کی خاطر تواضع والی انوکھی مصیبت سے چھٹکارا ملا۔

اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ چائے کے لیے وہ لوگ شیشے کی چھوٹی پیالی استعمال کرتے ہیں جسے وہ فنجان کہتے ہیں۔ یہ کپ ہی کی شکل کی ہوتی ہے، لیکن اتنی چھوٹی کہ اس میں بمشکل ایک چوتھائی کپ چائے آسکتی ہے اور چائے بھی عام طور پر بغیر دودھ کے استعمال کرتے ہیں، جسے بعض لوگ سلیمانی چائے بھی کہتے ہیں اور کبھی کوئی اسے شاہی احمر کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

جس قہوجی نے قہوہ دیا تھا اسی نے چائے دی۔ چائے کا رنگ اطمینان بخش تھا یعنی

مصریوں کی چائے کی طرح ثقیل اور کالی رنگ کی چائے نہیں تھی۔ اس کا ذائقہ بھی طبیعت کے مطابق تھا۔ میں نے ایک کے بعد دوسرا فنجان پی کر سابق طریقہ پر چائے پینے کا سلسلہ ختم کیا، پھر ہم دونوں کچھ دیر بعد شیخ کو سلام مصافحہ کر کے واپس ہو گئے۔

حج کا موسم ختم ہوتے ہی میں شیخ ابن باز کا ورقہ لے کر ریاض روانہ ہو گیا۔ سعودی عرب کے سبھی معزز لوگ شیخ کو جانتے اور عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سرکاری عہدیداران اور پولیس چوکی والے بھی انہیں اچھی طرح جانتے ہیں اور احترام کرتے ہیں۔ شاہی خاندان کے لوگ بھی یہاں تک کہ شاہ سعود و شاہ فیصل بھی اپنے باپ کی طرح ان کی عزت کرتے ہیں، بلکہ عیدین کے مواقع پر تو شاہ سعود و شاہ فیصل خود شیخ کے گھر جا کر شیخ سے ملاقات کرتے اور عید مبارک کہتے ہیں۔ یہ تھا اس وقت شیخ کا مقام! چنانچہ ریاض کے راستے میں جہاں چیک پوسٹ پر پولیس نے پاسپورٹ طلب کیا، میں نے انہیں شیخ ابن باز کا ورقہ پیش کر دیا اور شیخ کا ورقہ دیکھ کر انہوں نے مجھ سے مزید کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔

ریاض پہنچ کر شیخ ابن سنان حفظہ اللہ سے ملا اور شیخ ابن باز حفظہ اللہ کا خصوصی خط ان کے حوالہ کر دیا۔ انہوں نے خط پڑھ کر مجھے اپنے یہاں مہمان بنا لیا اور المعہد العلمی میں داخلہ مکمل ہونے تک تقریباً ڈیڑھ دو ماہ رہنے کا انتظام کر دیا اور کھانے پینے کا خصوصی خیال رکھا، بلکہ عام طور پر اپنی مجلس میں بلا کر اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھلایا۔ اب تک عرب مہمان نوازی کی جو کہانیاں لوگوں سے سنتا تھا یا کتابوں میں پڑھتا تھا، شیخ ابن سنان پر وہ ساری کہانیاں پوری پوری صادق آ رہی تھیں۔

جب شیخ ابن باز حفظہ اللہ بعد میں مکہ مکرمہ سے ریاض لوٹے تو ان کے گھر میں بھی ان سے بار بار ملنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مہمان نوازی میں شیخ ابن باز بھی فراخدل ہیں اور اگر یوں کہا جائے کہ وہ مہمان نوازی میں منتہی درجے تک پہنچے ہوئے ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا، بلکہ کبھی کبھی تو وہ اپنے مہمان و ملنے والوں کی موسمی ضروریات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

اس کا عملی تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں سعودی عرب پہنچنے کے چار پانچ سال بعد

اپنے بال بچوں سمیت ابتدائی سردی میں مدینہ منورہ جاتے ہوئے ایک دوروز کے لیے ریاض ٹھہر گیا تھا اور شیخ سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا اور ان سے ان کی مجلس میں سلام مصافحہ کیا، تو اتفاق سے اس مجلس میں شیخ ابن سنان بھی پہنچے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے بھی سلام ومصافحہ کیا اور خیر خیریت پوچھی پھر مجلس کی ایک خالی جگہ میں بیٹھ گیا۔

اتنے میں شیخ ابن سنان نے اُٹھ کر شیخ ابن باز کے پاس جا کر کان میں کچھ باتیں کیں پھر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، اس کے بعد شیخ ابن باز نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ جب میں ان کے قریب جا کر بیٹھا تو مزید خیر خیریت کی چند باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سوسو کے دو تین نوٹ اندر ہی اندر موڑ کر اپنی ہتھیلی میں چھپائے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ میں تھما دیے کہ اپنے اور بچوں کے لیے گرم کپڑے خرید لینا۔

میں نے کہا شیخ! میرے پاس کپڑے ہیں، لیکن شیخ نہیں مانے اور اصرار کرتے رہے کہ رکھ لو، بچوں کو نئے کپڑے خرید دینا۔ آخر مجھے خاموش ہونا پڑا اور شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے وہ پیسے رکھ لیے۔ پھر شیخ کے کہنے کے مطابق کچھ گرم کپڑے خرید لیے۔

جب المعہد العلمی کھلا تو میں نے داخلہ کے لیے درخواست دے دی۔ ہندوستان یو۔ پی (شاہ پور، اعظم گڑھ) کے ایک صاحب جناب حافظ عبدالرب بھی مکہ مکرمہ سے میرے ہی ساتھ ریاض گئے ہوئے تھے۔ دونوں کا ٹیسٹ ایک ہی ساتھ ہوا اور ثانویہ میں ہم دونوں کا داخلہ منظور کر لیا گیا۔ بہت دنوں تک ہم دونوں کی رہائش ایک ہی کمرے میں رہی۔ پھر جامعہ اسلامیہ کھلنے پر میں مدینہ منورہ چلا گیا اور جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا، لیکن وہ ریاض ہی میں رہ گئے۔ بعد میں جب کبھی ریاض سے میرا گزر ہوتا تو ان سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔

عبدالرب صاحب اگر چہ درسِ نظامیہ کے طالب علم تھے اور ساتھ ہی حافظ قرآن بھی، لیکن وہ شرعی عمل میں قدرے کمزور ثابت ہوئے۔ شروع شروع میں تو شعائر دین کے پابند نظر آ رہے تھے، مگر بعد میں شاید کچھ مصریوں، فلسطینیوں یا کچھ ڈھیلے ڈھالے اپ ٹو ڈیٹ سعودیوں کی صحبت میں رہ کر مرعوبیت کا شکار ہو گئے اور اپنی اچھی خاصی داڑھی کو چہرۂ مبارک

سے بالکل صاف کرڈالے۔اس حالت میں اتفاقاًان سے ایک روز ریاض میں ملاقات ہوئی تو ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد پھر جب ایک روز سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں ان سے ملاقات ہوگئی تو چہرہ پر مونچھ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اپ ٹو ڈیٹ داڑھی بھی نظر آئی۔شاید انہوں نے اپنے کسی رشتہ دار کی سرزنش کی وجہ سے یا ہندوستان میں اپنی مولویت کی لاج رکھنے کے لیے اتنی داڑھی رکھ لی تھی۔

ریاض میں ہم دونوں کے علاوہ ہندوستان، بہار کے ایک امیدوار جناب احمد زبیر صاحب (نثار احمد بن زبیر) اور پاکستان کے ایک امیدوار جناب عبداللہ مراد صاحب کا داخلہ بھی ثانویہ میں ہوا تھا اور اس طرح ہم چاروں طلبہ ایک ہی کلاس میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہ دونوں میرے ایسے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں دوست کہتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ ان میں سے اول الذکر جناب احمد زبیر کے ساتھ میری نرالی وگہری دوستی رہی، بلکہ ریاض جانے کے بعد جن لوگوں کے ساتھ میری گہری ومخلصانہ دوستی رہی اور عملی طور پر جنہیں بے لوث، خوددار، متدین اور دوستانہ تقاضوں کے سامنے مادی طمع ولالچ سے بالاتر پایا، ان میں یہ صاحب بلا مبالغہ اول درجہ کے دوست ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس دوستی کو تاحیات نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ریاض المعہد العلمی کی تعلیم میں مَیں اگرچہ زیادہ محنت کرنے کا اپنے آپ کو پابند نہیں بنا سکا، تاہم میں نے اتنی لاپرواہی بھی نہیں برتی کہ اساتذہ کی سرزنش کا سامنا کرنا پڑے۔بس اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ وہ ہر سال دورِاول ہی میں پاس کردیتا تھا۔دوسال کے بعد سالانہ چھٹی میں حج کے لیے مکہ مکرمہ گیا۔اس سال میرے کچھ رشتہ دار بھی حج کے لیے پہنچنے والے تھے۔مقررہ تاریخ میں جدہ پہنچ کر میں نے بندرگاہ میں ان لوگوں کا استقبال کیا۔پھران لوگوں کوساتھ لے کر میں نے مناسک حج پورے کرائے۔حج کے بعد بھی ہماری سالانہ چھٹی کے کافی ایام باقی تھے۔رشتہ داروں سے مل کر گھر کی یاد تازہ ہوگئی اور اسی چھٹی میں ہندوستان ہوآنے کا خیال دل ودماغ پر مسلط ہوگیا جو دھیرے دھیرے شوق وعزم میں تبدیل ہوگیا،لیکن دشواری

یہ تھی کہ اس وقت تک مجھے پاسپورٹ نہیں ملا تھا جب کہ اس کے لیے دو ڈھائی سال سے ہندوستانی سفارت خانہ جدہ میں کارروائی چل رہی تھی۔

میں نے اس سلسلے میں ہندوستانی سفیر جناب قدوائی صاحب سے مل کر ہندوستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ سفیر موصوف نے تعاون کرنے کا وعدہ کیا اور بتایا کہ ہم ایک ایمرجنسی سرٹیفکٹ تمہیں دے سکتے ہیں جس کے ذریعہ تم ہندوستان جا سکتے ہو۔ حسب وعدہ میں نے سفارت خانہ سے اپنے لیے ایمرجنسی سرٹیفکٹ حاصل کی اور اس پر خروج کا ویزا لگوایا پھر بحری جہاز سے ہندوستان روانہ ہو گیا۔

ہندوستان پہنچ کر ہفتہ دو ہفتے کے بعد کلکتہ سے نیا پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کئی چکر لگانے کے بعد محسوس ہوا کہ اس کارروائی کی تکمیل میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

جامعہ مظہر العلوم بٹنہ سے
پہلی سندِ فراغت

بیکار وقت گزارنا بہت کھل رہا تھا۔ پاسپورٹ کب پہنچے گا کچھ پتہ نہیں، چنانچہ میں نے انتظار کا یہ وقت اپنے پرانے مدرسہ جامعہ مظہر العلوم بٹنہ، مالدہ مغربی بنگال میں تعلیم حاصل کرنے پر صرف کرنے کا عزم کرلیا اور وہاں جا کر آٹھویں جماعت یعنی درجہ فراغت میں اسباق کی سماعت کرنے اور امتحان دینے کی اجازت حاصل کرلی، مدرسہ میں ہی قیام کیا اور پوری توجہ پڑھائی میں لگادی۔

یہاں میرے ایک بہت ہی باصلاحیت استاذ مولانا محمد مسلم صاحب رحمانی (حفظہ اللہ) موجود تھے۔ آپ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے فارغ شدہ ہیں۔ آپ جماعت اہل حدیث مغربی بنگال کے ایک جید عالم ہیں، بہت با اخلاق ومتواضع المزاج شخصیت کے مالک ہیں، آپ آٹھ دس سال تک جامعہ مظہر العلوم بٹنہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اور جب تک رہے صدر مدرس وشیخ الحدیث رہے۔ آپ اچھے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مقرر بھی ہیں۔ بنگال وبہار کا شاید ہی کوئی بڑا دینی وتبلیغی اجتماع ایسا ہوا ہوگا جس میں آپ کو مدعو نہ کیا گیا ہو۔ آپ کا درس جس طرح سلیس وسلجھا ہوا اور قابل فہم ہوتا ہے اسی طرح آپ کی تقریر بھی بہت معقول، جاذبِ توجہ اور دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حیات دراز فرمائے، صحتمند اور تندرست رکھے، اور آپ کے علم سے مزید لوگوں کو فیض پہنچائے۔

ان کے پاس ہم بخاری ومسلم پڑھتے رہے اور کچھ دیگر اساتذہ کے پاس ہماری دوسری

کتابوں کی پڑھائی ہوتی رہی۔

اس سے قبل جماعت ثالثہ تک کی تعلیم بھی میں نے اسی جامعہ میں حاصل کی تھی۔ یہاں کے ناظم مولانا عبدالحکیم صاحب (رحمہ اللہ) میرے بہت شفیق استاذ تھے اور ہمیں علم نحو کی کتاب بہت اچھی طرح پڑھاتے تھے۔ جب میں نحو کے بعض مسائل کی نشاندہی کر کے ان کے پاس جا کر استفسار کرتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ میرا اس طرح کا معمول دیکھ کر آپ کو اس بات کا پورا اطمینان ہو گیا تھا کہ میں پوری طرح سمجھ کر پڑھ رہا ہوں۔ کبھی وہ اپنے اس اطمینان کا تجربہ بھی کر لیتے تھے یعنی شروع سال میں جب میری کلاس کے نئے طلبہ کا ٹیسٹ لیتے تھے اور اتفاق سے میں وہاں نظر آ جاتا تھا تو نئے طلبہ جس سوال کا جواب نہیں دے سکتے تھے اس کا جواب مولانا صاحب مجھ سے بھی پوچھ لیتے اور میرے بتا دینے پر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔

اسی جامعہ میں جماعت ثانیہ و ثالثہ کی تعلیم کے دوران مولانا جمال الدین صاحب رحمہ اللہ میرے اور ایک استاذ تھے۔ یہ بھی دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے سند فراغت حاصل کیے تھے۔ آپ بھی مغربی بنگال کے بہت باصلاحیت اہل حدیث عالم تھے۔ ان کے پاس ہم منطق کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ بہت ہی خلیق و متواضع شخص تھے۔ آپ کی علمی صلاحیت کا پتہ ہمیں ان کی تدریس سے چلتا تھا۔ منطق کے مسائل بہت اچھے انداز سے سمجھانے کا ملکہ رکھتے تھے۔ ہم ان کے درس میں بھی بہت خوش رہتے تھے۔ اللہ انہیں بخر و عافیت رکھے اور ان کے علم سے طلبہ کو مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائے۔

شاید میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مذکورہ جامعہ مظہر العلوم کے ان دو رحمانی اساتذہ سے مجھے شرف تلمذ حاصل ہوا اور اس تلمذ نے دہلی کی اس مشہور درسگاہ دارالحدیث رحمانیہ سے میرا علمی رشتہ جوڑ دیا۔ کسی اچھے نسب یا اچھے سلسلہ سے تعلق رکھنا اچھی بات ہے بشرطیکہ خود اپنا کردار بھی اچھا ہو، ایسی صورت میں اس اچھے نسب یا اچھے سلسلہ سے اپنے تعلق کا اظہار کرنا ''سونے پر سہاگہ'' کا کام کرتا ہے۔

یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ کسی اچھے کردار کے مالک کو اچھا ثابت کرنے کے لیے اس کے نسب کا اچھا ہونا کوئی ضروری نہیں، کیوں کہ اس شخص کا اچھا کردار ہی اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے، جس طرح کسی پھول کے اچھے ہونے کی دلیل خود اس کی اچھی خوشبو ہوا کرتی ہے۔ اگر کسی شخص کا کردار ہی گھناؤنا اور قابل نفرت ہو اور بدکاری، کذب گوئی اور نفاق کے اوصاف سے بھرپور ہو تو اس کے اچھے نسب کا ذکر کرنا، خود اس نسب کی توہین کے مترادف ہوا کرتا ہے۔ ''پدرم سلطان بود'' کہنے کے بجائے ہر شخص کا عملی طور پر اپنے اچھے کردار سے اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنا ہی معقول بات ہے۔

اب تک کئی ایسے صاحبان سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے براہِ راست یا بالواسطہ باتوں میں فخریہ انداز سے ذکر کر دیا کہ ہمارے استاذ شیخ الحدیث یا فلاں شیخ التفسیر ہیں، لیکن جب ان کے چہرے مہرے پر نظر دوڑائی گئی یا جب ان کے بعض کردار کا نقشہ ذہن کی اسکرین پر اُبھرا تو محسوس ہوا کہ انہوں نے ان شیوخ کو اپنا استاذ کہہ کر گویا ان کی سخت توہین کر ڈالی۔ خیر جانے دیجیے ان باتوں کو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ان سب کو نیک عمل کی اور اپنے قول وعمل میں مطابقت رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مذکورہ جامعہ مظہر العلوم کے درجہ فراغت کے اسباق میں چند ماہ شرکت کرنے کے بعد سالانہ امتحان کا وقت ہو گیا۔ امتحان کی تیاری میں چند روز ڈٹ کر محنت کی اور امتحان شروع ہوتے ہی باقاعدہ امتحان میں شریک ہو گیا۔ اللہ کے فضل وکرم سے اچھا نمبر آیا، فرسٹ ڈویژن تیسری پوزیشن میں کامیابی ہوئی۔ دیگر فارغین کے ساتھ میری بھی دستار بندی ہوگئی اور اس کے دو تین ماہ کے بعد کلکتہ سے پاسپورٹ بھی آ گیا۔

طالب علمی کے ویزے پر
ریاض سعودی عرب کا باضابطہ سفر

اب ریاض واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے پاس جو پیسے تھے اب تک کی بھاگ دوڑ میں تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ واپسی کے لیے کچھ پیسے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کچھ رشتہ داروں سے اس کا ذکر بھی کیا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ شیطان نے میرے اور میرے والد صاحب کے درمیان غلط فہمی واختلاف کی ایک خلیج پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے میرے دیگر رشتہ دار میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ والد صاحب کی ناراضگی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اگر کوئی رشتہ دار میری مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو وہ جا کر انہیں دھمکی دے آتے تھے کہ اگر تم نے اسے مدد یا قرض دیا تو تمہارے ساتھ ہم اپنے تعلقات منقطع کر لیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اخیر میں اپنے ایک سگے چچا جناب محمد حسین صاحب کو اپنا حامی بنانے میں کامیاب ہو گیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ میں ریاض پہنچتے ہی آپ سے لیا ہوا قرضہ فوراً چکانے کا انتظام کر دوں گا۔ ان سے دو سو روپے قرض لیا جسے اس وقت کی ضرورت کے لیے کافی سمجھا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور مزید نیک عمل کی توفیق دے۔

میں ضروری تیار کے بعد دہلی کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں سعودی سفارت خانے سے ویزا حاصل کرنے کے بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی سے بحرین تک بحری جہاز پر سفر کرنا تھا، لیکن بحرین

سے ظہران تک ہوائی جہاز کا ٹکٹ لیے بغیر برطانوی سفارت خانے والوں نے بحرین کا ویزا دینے سے انکار کر دیا (اس وقت بحرین کے سفارتی امور برطانوی سفارت خانہ کے ذمہ تھے) ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے پیسے کم پڑ گئے۔ بمبئی جیسے اجنبی شہر میں کس سے قرض لیا جائے، یہ میرے لیے نیا مسئلہ بن گیا۔

بمبئی میں اگرچہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ تاہم اپنی جماعت کے کچھ لوگوں سے تعارف ہو چکا تھا۔ انہیں ملنے والوں میں بھائی کلہ کے ایک مخلص شخص جناب محمد یوسف بچہ والا تھے۔ یہ کوئی مالدار آدمی نہ تھے، لیکن ان کا دل بہت مالدار تھا۔ وہ میرے ساتھ ہر ملاقات پر بہت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ میں نے یوسف صاحب مذکور سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا اور کہا کہ شاید خود آپ کے لیے ممکن نہ ہو، لیکن آپ کے کسی ملنے والے سے کہہ کر کچھ قرض دلوانے کی کوشش کیجیے۔

جناب یوسف صاحب نے مجھے اپنے ملنے والے حاجی علیم اللہ نام کے ایک بزرگ سے ملایا۔ وہ مومن پورہ میں تنہا رہتے تھے۔ ممکن ہے ان کا کوئی دور کا رشتہ دار کہیں رہتا ہو، لیکن بمبئی میں اس کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا وہ بھی کوئی مالدار آدمی نہیں تھے، لیکن بہت مخلص تھے۔ جناب یوسف صاحب نے جب انہیں میرے بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگے کہ میری ایک معمولی ملازمت تھی جو میرے بڑھاپے کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ تنخواہوں کا جو پیسہ باقی تھا اب ملا ہے اور وہ آئندہ حج کے لیے رکھا ہوا ہے۔ اگر حج سے پہلے واپس کر سکتے ہیں تو اس میں سے جس قدر ضرورت ہو وہ لے سکتے ہیں۔ ان کی بات سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا ان شاء اللہ ریاض پہنچتے ہی دو ماہ کے اندر یہ پیسے آپ کے نام بھیج دوں گا۔ وہ میری بات سننے کے بعد دس دس والے نوٹ کی ایک گڈی نکال لائے اور میرے سامنے رکھ کر کہنے لگے کہ اس میں سے جتنے کی ضرورت ہو نکال لو۔ شاید میں نے دو تین سو کی ضرورت بتائی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ گنتی کر کے نکال دیجیے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میاں! خود ہی گن لو، اس میں کیا حرج ہے؟ اب میں نے اس گڈی سے بیس یا تیس نوٹ نکالے، پھر دوبارہ ان کے سامنے

گنا اور باقی گڈی انہیں واپس کر دی۔ اس کے بعد شکریہ کہتے ہوئے اور دعا دیتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ہمیں چائے پینے کے لیے روک لیا۔ میں اور جناب یوسف صاحب دونوں کچھ دیر اور بیٹھے اور چائے پی کر فارغ ہونے کے بعد سلام مصافحہ کر کے وہاں سے واپس ہو گئے۔

اس کے بعد برٹش ایئر ویز سے ہوائی ٹکٹ لے کر میں نے بحرین کے ویزا کے لیے کاغذات برٹش سفارت خانہ میں جمع کر دیے۔ مقررہ وقت پر مجھے ویزا مل گیا اور بذریعہ بحری جہاز بمبئی سے بحرین کے لیے روانہ ہو گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن ہمارے جہاز نے پاکستان کے مسافر لینے کے لیے کراچی بندرگاہ کا رُخ کیا، لیکن بدقسمتی سے بندرگاہ سے نکلنے والا ایک بحری جہاز ہمارے جہاز سے ٹکرا گیا۔ جہاز کے اندر ہمیں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ اندر سے بھاگ کر باہر عرشے پر جا کر دیکھا تو ٹکر مارنے والا جہاز وہاں سے دور ہٹتا ہوا نظر آیا۔ اس ٹکر کی مرمت کے لیے ہمارے جہاز کو مزید دو تین روز کراچی بندرگاہ میں رکنا پڑا۔ مرمت ہو جانے کے بعد وہاں کے مسافر لے کر آگے بڑھا اور چھ سات روز کے بعد بحرین پہنچا۔ بحرین اترتے ہی اسی روز شام کو بحرین سے بذریعہ ہوائی جہاز چند منٹ میں سعودی عرب کے مشہور ایئرپورٹ ظہران پہنچ گیا۔ دوسرے دن صبح دمام سے بذریعہ ریل گاڑی ریاض روانہ ہو گیا اور شام تک ریاض پہنچ گیا۔

ریاض کے المعہد العلمی میں نئے سال کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ میں وہاں پہنچ کر پڑھائی میں لگ گیا اور اپنے چچا نیز بمبئی کے جناب حاجی علیم اللہ صاحب کے قرضے کی ادائیگی کے لیے ایک ہی دن دونوں کے نام دو ڈرافٹ بنا کر رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ کر دیے۔

بمبئی کے حاجی صاحب کا قرضہ حسب وعدہ چکا دینے کی وجہ سے میرے سلسلے میں ان کا اعتماد مضبوط ہو گیا۔ ان کو شہر میں رہنے کی وجہ سے ڈرافٹ بھنانے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی، لیکن چچا صاحب کو دیہات میں رہنے کی وجہ سے شہر جا کر بالواسطہ ڈرافٹ بھنانے میں قدرے تاخیر ہوئی اور مزید تاخیر اس وجہ سے بھی ہو گئی کہ وہ مختلف کاغذات کے ساتھ شہر

جانے آنے اور کاغذات کے ہیر پھیر میں وہ اپنا ڈرافٹ گم کر چکے تھے۔ انہوں نے ایک خط کے ذریعہ مجھے اطلاع دی کہ ڈرافٹ گم ہوگیا ہے، بہت ڈھونڈا لیکن نہیں ملا، لہٰذا اس کی بابت کے لیے جو کارروائی مناسب ہو کرو۔ یہ خبر پاتے ہی میں نے اس ڈرافٹ کو کینسل کرا کے اس کے عوض بذریعہ ٹرانسفر اسی قدر مبلغ ادا کرنے کا انتظام کر دیا۔ ابھی میں اس کارروائی سے فارغ ہو ہی رہا تھا کہ چچا صاحب مذکور نے دوسرے خط کے ذریعہ بتایا کہ وہ ڈرافٹ مل گیا ہے اور اسے کیش بھی کرا لیا ہے۔ اس خبر پر میں نے جلدی بینک کا مذکورہ ٹرانسفر کینسل کر کے اس معاملہ کو رفع دفع کرایا۔

چچا صاحب کا قرض دینا جس طرح مجھ پر ایک بڑا احسان تھا اسی طرح بمبئی کے حاجی صاحب مذکور کا قرض دینا مجھ پر دوسرا بڑا احسان تھا، لیکن دونوں کے ان احسانات میں کافی فرق محسوس کیا۔ چچا صاحب نے بذاتِ خود تو میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور اس پر برقرار بھی ہے اور قرض دینے کے بعد کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا جو ایک اچھے انسان کا شیوہ ہے۔ میں نے بھی "هل جزاء الإحسان إلا الإحسان" کے اخلاقی ضابطہ کو سامنے رکھ کر چچا اور اگلی پچھلی دونوں چاچیوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن تعاون کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بعض چچازاد بھائیوں نے اپنے والد کے کیے ہوئے احسان جتانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ اگرچہ ان لوگوں کا ایسا کرنا ان کی اپنی جہالت پر مبنی تھا، تاہم اس سے مجھے قدرے تکلیف ضرور محسوس ہوئی۔

اس کے برعکس بمبئی کے حاجی صاحب مذکور نے جس انداز سے مجھے قرض دے کر احسان کیا تھا وہ انداز ہی نرالا تھا۔ گویا انھوں نے اس قرض کو احسان نہیں بلکہ کسی کی مجبوری دور کرنے کے لیے اپنا اخلاقی فرض سمجھا تھا، جس کی وجہ سے ان کی عزت و احترام نے میرے دل کی گہرائیوں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی بمبئی سے میرا گزر ہوا میں ان سے ملے بغیر آگے نہیں بڑھا اور جب وہ کچھ دنوں بعد مدینہ منورہ پہنچے تو انہیں اپنے گھر ٹھہرا کر ان کی خدمت کرنے میں مجھے دلی خوشی محسوس ہوئی، یہاں تک کہ جب ایک دوسری

جامعہ اسلامیہ

مدینہ منورہ میں داخلہ

مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک نئی یونیورسٹی کھلنے کے بارے میں کچھ روز قبل ہی سے بات چیت چل رہی تھی۔ جب میں ہندوستان سے ریاض کے المعہد العلمی لوٹا تو اُس وقت اس جامعہ اسلامیہ کا افتتاح ہو چکا تھا اور ہمارے اس معہد علمی کے طلبہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لے سکتا ہے۔ اس کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعہ طلبہ کو ریاض سے مدینہ منورہ بھیجنے کا خصوصی اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس طرح المعہد العلمی کے طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد مدینہ منورہ منتقل ہو چکی تھی۔ جب میں ریاض پہنچا اور مجھے بھی یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے بھی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دی اور باقاعدہ اجازت لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میرا داخلہ ثانویہ کے درجہ اولیٰ میں ہوا جو ریاض المعہد الثانوی کی چوتھی کلاس کے برابر تھا۔

جامعہ اسلامیہ میں نیا نیا انتظام ہونے کے باوجود ہر چیز اطمینان بخش تھی۔ تین سال کے بعد ثانویہ کا فائنل امتحان دے کر کلیہ شریعہ (شریعت کالج) میں داخلہ لیا۔ ثانویہ کے آخری سال میں پڑھتے وقت ہی میں اپنی اہلیہ اور دو بچوں کو بھی ہندوستان سے مدینہ منورہ لے گیا اور کرایہ کا مکان لے کر بال بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ جامعہ اسلامیہ سے جو وظیفہ ملتا تھا اسی سے کفایت شعاری کے ساتھ کام چلاتا رہا اور جب جامعہ کی طرف سے ہر سال طالب علم کو وطن جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملنے لگا تو میں بچوں کو مدینہ منورہ میں چھوڑ کر بیچ بیچ میں ایک دو ہفتے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز ہندوستان بھی آتا جاتا رہا۔

ہندوستانی طلبہ کی نمائندگی

جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لینے کے بعد ہندوستانی طلبہ کے آپسی تنظیمی معاملات کو سدھارنے کے لیے مجھے قدرے دلچسپی لینی پڑی۔ اس دلچسپی کا سبب کچھ اس طرح پیدا ہو گیا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اس جامعہ اسلامیہ کے لیے آئے ہوئے طلبہ میں سے ایک حضرت نے اپنے آپ کو بقلم خود ہندوستانی طلبہ کا صدر بنا کر ہندوستانی سفارت خانہ جدہ سے خط و کتابت کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات دیگر چند طلبہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی کھلی، چنانچہ میں نے ہندوستانی طلبہ سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا اور کہا کہ جامعہ کے سارے ہندوستانی طلبہ ایک میٹنگ کر کے آپس میں کسی ایک طالب علم کو صدر مان لیں تا کہ بقلم خود بنے ہوئے صدر کے بجائے منتخب صدر ہی تمام ہندوستانی طلبہ کی نمائندگی کرے۔ ساتھیوں نے اس خیال کو سراہا اور ایک میٹنگ ہو گئی، لیکن جس بات کو ایک بار بھی دل میں جگہ نہیں دی تھی وہی بات سر پر آن پڑی اور تمام ہندوستانی طلبہ نے متفقہ طور پر مجھے ہی بعثة طلبة الهند (انجمن طلبۂ ہند) کا صدر منتخب کر لیا۔ میری معذرت سننے کے بجائے سبھوں نے مجھ سے خاموش رہنے کی استدعا کی۔ تمام طلبہ کے اجماع کو ٹھکرانا مناسب نہیں تھا۔ آخر چارو ناچار مجھے اس انتخاب کا نتیجہ قبول کرنا پڑا۔ چونکہ انتخاب سے قبل بقلم خود صدر بننے کے جراثیم ہندوستانی سفارت خانہ جدہ تک پہنچ چکے تھے، اس لیے اس انتخاب کی کارروائی کی ایک فوٹو کاپی ہندوستانی سفارت خانہ جدہ کو بھیج دی گئی، تا کہ سفارت خانہ سے آئندہ خط وکتابت اسی منتخب صدر کے نام پر ہو اور یہی منتخب صدر کسی تقریب یا اجلاس میں جامعہ

اسلامیہ کے تمام ہندوستانی طلبہ کی نمائندگی کرے۔

اتنی باقاعدہ کارروائی ہونے کے باوجود سابق بقلم خود بنے ہوئے نام نہاد صدر نے پھر سفارت خانہ جا کر اور یہ کہہ کر اپنی چودھراہٹ جمانے کی کوشش کی کہ جامعہ کے ہندوتانی طلبہ کے صدر وہی ہیں۔ اس پر وہاں بھیجی گئی انتخابی کارروائی کی فوٹو کاپی کی روشنی میں سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری سید شہاب الدین صاحب کی طرف سے اس نام نہاد صدر کی اچھی خاصی سرزنش ہوئی۔ پھر اس کے بعد بقلم خود ہندوستانی طلبہ کی صدارت کرنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ہندوستانی طلبہ کی اس انجمن کے نام سے ہندوستان کے مختلف جرائد ورسائل جاری کروا کے باقاعدہ مطالعہ کا انتظام کیا گیا اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ اس انجمن کا ایک دستور بھی مرتب کرلیا گیا جس کی روشنی میں ہر سال ہندوستانی طلبہ اپنا صدر منتخب کرتے رہے۔ دوسرے سال کے انتخاب میں بھی ان طلبہ کی اکثریت نے دوبارہ اس عہدے پر مجھے ہی چنا، لیکن میں نے درمیان سال میں استعفیٰ دے کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیا اور اپنی پڑھائی میں زیادہ توجہ دینے کی کوشش شروع کردی۔

مدینہ منورہ میں

چند کھرے کھوٹے دوستوں کی پہچان

کسی کو اچھا یا برا سمجھنے کی بہترین کسوٹی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تجرباتی بیان کے مطابق تین ہیں: پہلی یہ کہ اس کے ساتھ سفر کیا گیا ہو، دوسری یہ کہ اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا گیا ہو اور تیسری یہ کہ اس کے پڑوس میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔

مدینہ منورہ پہنچ کر جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہونے تک مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور معاملہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ کے ابتدائی ایام میں جامعہ سلفیہ بنارس، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دیوبند، افضل العلماء کیرالا اور احمدیہ سلفیہ دربھنگہ وغیرہ سے ہندوستانی طلبہ کے کئی وفود پہنچے۔ چونکہ جامعہ اسلامیہ میں میرا داخلہ ریاض کے المعہد العلمی سے منتقل ہونے کی وجہ سے قدرے پہلے ہی ہو چکا تھا اور ان ہندوستانی وفود کے پہنچتے وقت بھی میں وہاں موجود تھا، چنانچہ میرا اخلاقی فرض بنتا تھا کہ ان وفود کے نئے آئے ہوئے طلبہ کے نظم ونسق ٹھیک ہونے تک ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں۔ ان کو داخلہ کے سلسلے میں جن سے ملنا ہے جلدی ملا دوں، ان کے سامان وغیرہ استقبالیہ روم میں رکھوا دوں اور انہیں ناشتے و کھانے کی میز تک پہنچا دوں وغیرہ وغیرہ۔

میرے اس برتاؤ سے ان لوگوں نے اچھا اثر لیا اور مجھے اپنا خیر خواہ سمجھنے لگے اور بوقت ضرورت ہم ایک دوسرے کے کام بھی آتے رہے، لیکن کون کیسا ہے یہ تو کچھ روز ایک دوسرے کو برتنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے۔ ذیل کے سطور میں ایسے ہی چند حضرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ہندوستانی مخلص دوستوں میں سے نہایت شریف ومتواضع دوست جناب عبدالرحمن صاحب مبارکپوری تھے۔ یہ یو۔ پی اعظم گڑھ قصبہ مبارکپور کے مشہور عالم وشیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مولف مرعاۃ المفاتیح کے بڑے لڑکے ہیں۔ شیخ الحدیث صاحب کو میں فیض عام مئو کے تعلیمی ایام ہی سے جانتا تھا۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد بھی ان سے کئی بار ملاقات کا مجھے شرف حاصل ہوا، ایک دوبار مبارکپور خود ان کے دولت خانے میں بھی ملنے گیا۔ آپ نہایت ہی شریف، متواضع المزاج اور منتہی درجے کے مہمان نواز شخص ہیں۔ طالب علم کی ہمت افزائی دل کھول کر فرماتے تھے۔ میں نے فن میراث میں ''تیسیر الفرائض'' کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی اور کتابت کراکے کتابی شکل میں اس کی فوٹو کاپی کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیجا کہ ازراہِ کرم اس پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت فرمائیں۔ اگر کہیں غلطی نظر آئے تو ناچیز کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ پریس میں دینے سے پہلے اس کی اِصلاح ہوجائے، اس کا اردو نسخہ آپ کو عنقریب بھیج رہا ہوں۔ انہوں نے وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے چند کلمات میں اس کتاب کو بہت سراہا جن کا عکس تاثرات کے تحت اردو نسخہ میں شامل کر دیا گیا ہے اور عربی ترجمہ عربی نسخہ میں۔

عبدالرحمن صاحب مبارکپوری سے تعارف اسی مدینہ منورہ ہی میں ہندوستانی وفود کے استقبال کے موقع پر ہوا اور شیخ الحدیث صاحب کے ساتھ حسن عقیدت رکھنے کی وجہ سے عبدالرحمن صاحب کا تعارف بہت جلد دوستی میں بدل گیا اور چونکہ یہ دوستی کسی دنیاوی مفاد کے پیش نظر نہیں تھی اس لیے اللہ کے فضل سے اس میں برابر اِخلاص کا رنگ بھرتا گیا اور یہ مخلصانہ دوستی اب تک برقرار ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گی۔

۲۔ ان وفود کا ایک دوسرا شخص ملیبار کیرالا کا رہنے والا تھا۔ جامعہ کے مامور السکن نے ان کو جس کمرہ میں جگہ دی اس میں مَیں اور افریقہ کا ایک طالب علم پہلے ہی سے رہ رہے تھے۔ ان کے اس کمرے میں آنے سے ہم تین ہوگئے اور دوستانہ ماحول میں ہمارے ایام گزرتے رہے۔ جامعہ اسلامیہ کے ہندوستانی وغیر ہندوستانی سبھی طلبہ سے میرے اچھے تعلقات تھے،

لیکن ان ملیباری صاحب کے ساتھ ہندوستانی ہونے کے ناطے نیز ایک کمرے میں رہنے کی وجہ سے تعلقات گہرے ہوتے گئے اور آپس کی بے تکلفی میں ترقی ہوتی گئی، لیکن ان کے درج ذیل معاملات قدرے تکلیف دہ بھی رہے:

(الف) جب یہ ہندوستان سے آئے تو ان کے پاس ایک گھڑی تھی جو کئی سال کی پرانی تھی۔ مدینہ منورہ آنے کے چند ماہ بعد جب یہ یہ گھڑی قدرے خراب ہوگئی تو انہوں نے اسے رکھ کر وہاں سے ایک نئی گھڑی خرید لی۔ میں جب ہندوستان سے دوبارہ سعودی عرب لوٹا تو آتے وقت اپنی گھڑی کسی بھائی کو دے دیا اور نئی گھڑی خریدنے کے لیے حج کے موسم کا انتظار کرتا رہا۔ ایک روز میں نے ان سے کہا کہ بھائی صاحب! میں اپنی گھڑی ہندوستان چھوڑ آیا ہوں۔ حج کے موسم میں نئی نئی گھڑیاں مارکیٹ میں آجائیں گی۔ اس وقت تک اگر آپ اپنی پرانی گھڑی مجھے مستعار دے دیں تو میں اسے مرمت کرا کے استعمال کرتا رہوں اور نئی گھڑی خریدتے ہی میں آپ کی یہ گھڑی واپس کردوں۔

انہوں نے راضی خوشی اپنی وہ پرانی گھڑی مجھے دے دی۔ میں نے اسے ٹھیک کرا کے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ مسجد نبوی کے بازو میں بنے ہوئے وضوخانے میں وضو کرنے گیا۔ وضو کا پائپ جو چوکور ڈھائی فٹ اونچے پیلر کے ساتھ جما ہوا تھا انہی میں سے ایک پیلر پر میں وہ گھڑی رکھ کر وضو کرنے لگا۔ وضو سے فارغ ہوگیا مگر رکھی ہوئی گھڑی کا خیال نہیں رہا اور جب میں وہاں سے باہر نکل آیا تو گھڑی یاد آئی۔ جلدی دوبارہ وضوخانہ پہنچ کر اس پیلر پر نظر دوڑائی تو وہاں سے گھڑی غائب ہو چکی تھی۔ اَن گنت جانے آنے والوں میں سے نہ کسی کو پوچھ سکتا تھا اور نہ کسی پر شبہ کر کے جیب کی تلاشی لے سکتا تھا۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے نکلا اور مسجد کے اندر جا کر نمازیوں میں شامل ہوگیا۔

اس واقعہ سے مجھے بہت افسوس ہوا، کیوں کہ وہ دوسرے کی گھڑی تھی۔ اس حادثہ کے بعد جامعہ جا کر ان صاحب سے ملا اور بتایا کہ آپ کی گھڑی جو میں نے کچھ روز استعمال کے لیے لی تھی اس طرح گم ہوگئی جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ انہوں نے سن کر مجھے تسلی دی کہ کوئی

بات نہیں، جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک لمبی مدت گزر گئی۔ انہوں نے گھڑی کے سلسلے میں پھر کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ان کی طرف سے اس جیسی دوسری گھڑی واپس کرنے کی کوئی بات آئی اور نہ اس کا معاوضہ لینے کا کوئی اشارہ دیا جس سے میں نے یہ سمجھا کہ انہیں اس گھڑی کا کوئی بدل مطلوب نہیں۔

میں انہیں اپنے ہی جیسا سیدھا آدمی سمجھ رہا تھا، لیکن ایک سفر کے دوران کچھ مشترکہ اخراجات کے سلسلے میں جب حساب ہوا تو انہوں نے اس گمشدہ گھڑی کا تذکرہ کر دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جس طرح انہوں نے گمشدہ گھڑی کا کوئی بدل طلب نہیں کیا اسی طرح میں بھی سفر کے مشترکہ اخراجات میں ان کا خرچہ طلب نہ کروں۔ میں نے کہا کہ چونکہ اس گمشدہ گھڑی کی خبر پا کر آپ نے مجھے تسلی دی تھی اور ایک لمبی مدت گزر جانے کے باوجود اس کا کوئی بدل طلب نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ کو اس گھڑی کا بدل مطلوب نہیں، لیکن اب جب اس گھڑی کا آپ نے تذکرہ کر دیا تو میری طرف سے یہ سو روپے کا نوٹ حاضر ہے، اس میں سے آپ اپنی اس پرانی گھڑی کی، جس کی میری طرف سے کچھ خرچ کر کے مرمت کی گئی تھی، جو قیمت مناسب سمجھیں لے لیں اور اس سفر کے حساب سے اس گھڑی کا کوئی تعلق نہ جوڑیں۔ پھر کچھ بحث و مباحثہ کے بعد ہمارے درمیان مفاہمت ہو گئی اور ہم نے حساب کتاب صاف کر لیا۔

(ب) ایک اور واقعہ بھی انہی ملیباری صاحب کے ساتھ پیش آیا جو بہت زیادہ دلچسپ ہے اور ساتھ ہی تکلیف دہ بھی۔ مدینہ منورہ میں دو سال گزارنے کے بعد، میں اپنی اہلیہ اور دو بچوں کو مدینہ منورہ لے گیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی مجھ سے ایک دو ماہ قبل اپنے بال بچوں کو مدینہ منورہ لے گئے تھے۔ وہ مسجد نبوی کے قریب شمال کی طرف واقع رباط بھوپال کی تیسری منزل کرایہ پر لے کر اپنے بال بچوں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ میں بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ مسجد نبوی کے قریب شمال مغرب میں ایک ہندوستانی ضلع ندیا کے کرایہ دار کے مکان میں عارضی طور پر رہنے لگا تھا اور کسی مناسب مکان کی تلاش میں تھا۔ یہ ندیاوی شخص بھی جامعہ

اسلامیہ کے طالب علم تھے۔

جامعہ اسلامیہ کے جو طلبہ شہر میں رہتے تھے تقریباً ایک ہی ساتھ جامعہ کی بس سے روزانہ جامعہ جایا آیا کرتے تھے۔ سابق الذکر ملیباری صاحب کو کسی طرح معلوم ہوا کہ مجھے اہلیہ کے ساتھ رہنے کے لیے کسی مکان کی تلاش ہے، چنانچہ وہ مجھ سے مل کر رباط بھوپال کی تیسری منزل کا ایک فلیٹ یعنی تقریباً آدھا حصہ مجھے کرایہ پر دینے کی پیشکش کرنے لگے۔ میں نے اس کے ساتھ جا کر جگہ دیکھی اور اس کا کرایہ اس پوری منزل کے کل کرائے کے آدھے سے دس پانچ ریال کم کرایہ پر اتفاق کر لیا، کیوں کہ ان کا فلیٹ قدرے بڑا تھا اور میرا والا قدرے چھوٹا۔ اس کے بعد اپنے بال بچوں کو لے کر میں اس فلیٹ میں رہنے لگا۔

جیسا کہ ہم دونوں نے طے کیا تھا، میں ہر ماہ کوئی رسید لیے بغیر انہیں کرایہ ادا کرتا رہا۔ جب حج کا موسم قریب آیا تو انہوں نے بالواسطہ مجھے اطلاع کرائی کہ اب عطاء الرحمن مکان خالی کر دے۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ اس مسئلہ پر میں نے ذرا غور کیا تو محسوس ہوا کہ اب حاجیوں کی آمد پر شاید انہیں زیادہ کرایہ مل سکتا ہے اس لیے وہ مجھ سے یہ مکان خالی کرانا چاہتے ہیں اور اس سے قبل چونکہ پوری منزل کا کرایہ ادا کرنا انہیں تنہا بھاری پڑتا تھا اس لیے آدھا حصہ مجھے کرایہ پر دینے کی پیشکش کی تھی۔ اب اگر میں ان کی خواہش کے مطابق یہ مکان چھوڑ دوں تو حج کی موسمی بھیڑ بھاڑ میں مسجد نبوی کے اتنے قریب مجھے دوسرا مکان ملنا مشکل ہے۔ اپنا کرایہ ہلکا کرنے کے لیے مکان میں مجھے شریک کر لینا اور حاجیوں سے زیادہ کرایہ پانے کی لالچ میں مجھ سے مکان خالی کرا لینے کا منصوبہ بنانا اس وقت میرے خلاف ایک خطرناک سازش ہے۔

انہوں نے کئی لوگوں سے یہ بھی کہا کہ محمد عطاء الرحمن بال بچوں کے ساتھ سڑک پر پڑے ہوئے تھے، میں نے انہیں چند روز کے لیے جگہ دی تھی، لیکن وہ مکان خالی کرنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں سابق الذکر ندیاوی صاحب کے مکان کی نچلی منزل میں عارضی طور پر بچوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس دوران ملیباری صاحب سے کرایہ پر ان کے مکان میں شریک ہونے کے سلسلے میں بالکل غیر مشروط مدت کے لیے اتفاق

ہوا تھا۔ صرف غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی تحریر نہیں لکھوائی گئی تھی۔

اب میں ان کے اس منصوبہ کو ناکام بنانے کی فکر میں لگ گیا۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص کرایہ پر کسی مکان میں رہتا ہے تو مالک مکان اسے بغیر کسی قصور کے قانونی طور پر مکان سے نہیں نکال سکتا، لیکن اس کے لیے کرایہ داری کا کوئی ثبوت رہنا چاہیے۔ میرے پاس ملیباری صاحب کی طرف سے کرایہ داری کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے ان سے کرایہ داری کا ایک کاغذ مل جائے تو پھر میں مکان خالی نہ کرنے کا خیال ظاہر کر سکتا ہوں، لیکن اس کے لیے مجھے چند چھوٹی باتوں کا سہارا لینا پڑے گا۔

میں نے ملیباری صاحب کو ایک روز بلا کر کہا: ''معلوم ہوا کہ آپ مجھ سے مکان خالی کرانا چاہتے ہیں، لیکن بالواسطہ کہنے کے بجائے یہ بات آپ مجھ سے براہِ راست کہہ سکتے تھے۔ خیر جانے دیجیے، آپ کا پیغام پہنچ گیا۔ اب مکان ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیے، مکان ملتے ہی میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔ ان کی طرف سے مکان خالی کرانے کا بالواسطہ بھیجا ہوا پیغام میں نے ان کے سامنے دوہرایا، لیکن انہوں نے اس کی تردید نہیں کی، جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ مکان خالی کرانے کی سازش انہی کی ہے۔

پھر میں نے دو تین روز کے بعد انہیں کہا کہ ایک مکان کا پتہ لگا لیا ہے۔ اب بات پکی کرنی ہے، حالانکہ میں نے نہ کوئی مکان ڈھونڈا تھا اور نہ کسی مکان کا پتہ لگایا تھا۔ میں تو صرف یہ سب کہہ کر ان کو ہموار کر رہا تھا، تاکہ وہ کسی روز میرے ساتھ مجلس میں بیٹھ کر اس مسئلہ میں کھل بات کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اب تک کے وصول کردہ کرایہ کی رسید مجھے لکھ دیں۔ نیز میں اس مجلس میں ان سے جو سوالات کروں ان کا بھی وہ جواب دے دیں۔ اور میں چپکے سے ان کا وہ جواب ٹیپ رکارڈر کے ذریعہ ٹیپ کر لوں جو میری صفائی کی دلیل بن سکے۔

میں نے اپنے فلیٹ میں دونوں کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ دونوں کے بیچ میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی پیٹی رکھ دی جس کا ایک سائڈ کھلا تھا۔ اس پیٹی کو ایک کپڑا سے ڈھانک دیا اور اس کے نیچے ایک ٹیپ ریکارڈر رکھ دیا۔ اب اس ڈیکس نما پیٹی پر کھانے پینے کی کچھ چیزیں رکھ دیں،

صدقِ دل سے جواب دیں گے۔ میں اور آپ اب تک پڑوسی کی طرح اپنی اپنی فیملی کے ساتھ ایک ہی منزل کے اپنے اپنے فلیٹ میں ٹھہرے۔ مجھ سے اب تک آپ کو تکلیف تو نہیں پہنچی؟

ج: حاشا وکلا، نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔

س: میری طرف سے یا میری اہلیہ کی طرف سے اب تک آپ کی فیملی کی کوئی بے پردگی تو نہیں ہوئی ہے؟

ج: لاحول ولا قوۃ۔ ان سوالات کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی ایسی کوئی بات ہے۔ اب اجازت دیجیے میں جانا چاہتا ہوں۔

میں نے یہ کہہ کر مجلس ختم کر دی کہ ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتے ہیں۔ میں صرف اپنی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں میری طرف سے کوئی چوک نہ ہو گئی ہو جس کی وجہ سے آپ کو مکان خالی کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی، خیر مع السلام۔

ان صاحب کو رخصت کر کے میں نے ٹیپ بند کر دیا اور اس کے بعد فوراً فوٹو اسٹوڈیو جا کر اس کی دی ہوئی تحریر کی کئی فوٹو کاپیاں کرالیں تا کہ ان کے ساتھ ایک ہی منزل کے دوسرے فلیٹ میں میرے کرایہ پر رہنے کے ثبوت کا اصل کاغذ میرے پاس محفوظ رہے اور ہمارے معاملہ کا تصفیہ کرنے والوں کو بوقت ضرورت اس کی کاپی دکھا سکوں۔

پھر میں نے ان کی تحریر کی ایک کاپی لفافہ میں ڈالی اور عربی میں ایک خط لکھ کر اس کے ساتھ رکھ دیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

''محترم ملیباری صاحب! السلام علیکم۔ مجھے کچھ روز پہلے بالواسطہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ مجھے اس فلیٹ سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے بعض احباب کو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ محمد عطاء الرحمن اپنی اہلیہ کے ساتھ سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھا تو بطور احسان چند روز کے لیے میں نے اپنے گھر کے ایک فلیٹ میں جگہ دی، لیکن اتنے روز ہو گئے وہ یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتا۔ اسے میرا گھر خالی کر دینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔''

''لیکن بھائی صاحب! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ندیاوی کے ساتھ ان کے گھر

کی نچلی منزل کے ہال میں عارضی طور پر اپنی اہلیہ کے ساتھ رہتا تھا اور مکان کی تلاش میں تھا، اس پر آپ نے اپنی منزل کے دوسرے فلیٹ میں کرایہ پر رہنے کے لیے مجھے پیشکش کی تو میں نے آپ کے ساتھ جا کر پہلے فلیٹ دیکھا پھر اس کا ماہانہ کرایہ طے کرنے کے بعد اس فلیٹ میں رہنا شروع کیا اور کوئی رسید لیے بغیر آپ کو کرایہ بھی ادا کرتا رہا۔ کرایہ طے کرتے وقت صرف چند روز یا چند ماہ کی کوئی شرط نہیں تھی، لیکن آپ نے اپنے احباب کے ذریعہ اس طرح کی بات پھیلائی اور حج کا موسم قریب آتے ہی یہ پروپیگنڈہ کرانا شروع کر دیا۔"

"ایسے وقت میں آپ کے اس طرح کے پروپیگنڈے سے محسوس ہوتا ہے کہ جب پوری منزل کا کرایہ آپ پر تنہا بھاری پڑ رہا تھا اُس وقت آپ نے تخفیف و سہولت کے لیے اس گھر میں مجھے کرایہ پر رہنے کی پیشکش کی اور اب جب کہ حج کا موسم قریب آ گیا اور حاجیوں کی آمد پر آپ کو اس فلیٹ سے زیادہ کرایہ ملنے کی امید ہو گئی تو آپ مجھ سے فلیٹ خالی کرانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن بھائی صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس فلیٹ میں مفت نہیں رہتا۔ میں یہاں ماہانہ کرایہ دے کر رہتا ہوں اور سرکاری قانون کی رو سے جب تک کرایہ دار کرایہ ادا کرتا رہتا ہے مالک اس سے مکان خالی نہیں کرا سکتا۔ اب تک چونکہ میرے پاس کرایہ داری کا کوئی ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پر میں یہاں جمے رہنے کا دعویٰ کرتا، اس لیے مجھے اپنے بچاؤ کے لیے آپ سے کرایہ داری کا ثبوت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے آپ کی خواہش کے مطابق کہہ دیا کہ دوسرا مکان تلاش کر رہا ہوں، حالانکہ میں کوئی مکان تلاش نہیں کر رہا تھا۔"

"اب چونکہ آپ نے مجھے کرایہ داری کی تحریر دے دی ہے جو میرے لیے واضح ثبوت ہے کہ میں آپ کے اس دوسرے فلیٹ میں کرایہ پر رہتا ہوں اور میرے ذمہ کوئی کرایہ بھی باقی نہیں ہے۔ میں نے آپ کی تحریر پر دو گواہوں کے دستخط کرانے کا اشارہ کیا تو آپ نے کہہ دیا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن آپ نے اپنی تحریر خود پڑھ کر سنائی ہے کہ اب تک کا سارا کرایہ آپ وصول کر چکے ہیں نیز میری طرف سے آپ کو کوئی اذیت یا نقصان نہ پہنچنے کا بھی

آپ نے اعتراف کیا ہے۔آپ کی یہ ساری باتیں ٹیپ کر لی گئی ہیں۔اب خود آپ کی آواز اور کرایہ داری کی یہ تحریریں مضبوط گواہ بن سکتی ہیں۔''

''اب مجھے صراحت کے ساتھ یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ میں اس فلیٹ کو خالی نہیں کروں گا۔اس فلیٹ کی میری یہ کرایہ داری اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک آپ کی اس منزل پر کرایہ داری باقی رہے گی۔اب آپ جو جی چاہے کر لیں۔میں آپ کا ہر چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔والسلام۔آپ کا محمد عطاء الرحمن بہاری۔''

میرا یہ خط پڑھتے ہی ملیباری صاحب غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے اور جو جی میں آیا سنانے لگے۔میں نہایت صبر سے سنتا رہا اور پوری سنجیدگی سے ایک آدھ کا بہت نرم اسلوب میں جواب بھی دیتا رہا۔چند منٹ بعد وہ گھر سے نکل کر کہیں چلے گئے اور کچھ دیر بعد اپنے خسر صاحب کو بلا لائے،جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک ملازم تھے اور وہ میرے بھی خیر خواہ تھے۔

ان کے خسر صاحب نے آکر پہلے ہی کی طرح پیار و محبت سے دریافت کیا کہ یہ آپ لوگوں میں کیا ہو گیا؟اس استفسار پر میں نے ساری باتیں سنائیں۔پھر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اب مسئلہ کا حل کیسے ہوگا؟اس پر میں نے کہا کہ اس فلیٹ پر کرایہ داری کا میرے ساتھ باقاعدہ معاہدہ جس میں صراحت سے یہ لکھنا پڑے گا کہ محمد عطاء الرحمن کو اس فلیٹ میں اُس وقت تک رہنے کا اختیار ہوگا جب تک ان ملیباری بھائی کی اس منزل پر کرایہ داری رہے گی اور اس معاہدہ پر آپ کی گواہی ہوگی۔پھر باقاعدہ معاہدہ نامہ تیار کیا گیا اور کئی سال تک میں اہلیہ کے ساتھ وہاں رہا،پھر اس کے بعد حارہ شرقیہ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر وہاں سے منتقل ہو گیا۔

۳۔مذکورہ بالا نمبر(۲)کے دوست کے برعکس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اسی کیرالہ(ملیبار)کے ایک دوست ایسے بھی ملے جن کا اخلاص و حسن سلوک کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ان کا نام پی سعید مرکار ہے۔یہ بھی ریاض کے میرے ایک مخلص ساتھی جناب احمد

زبیر (نثار احمد زبیر) جیسے بے لوث وخوددار دوست ہیں جن کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔ ان کے تذکرہ سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو قابل عبرت ہے۔

جناب سعید مرکار صاحب نے صوبہ تامل ناڈو کے جامعہ دارالسلام عمر آباد میں تعلیم پائی۔ پھر جب انہوں نے مدینہ منورہ کے جامعہ اسلامیہ میں اپنے داخلہ کے سلسلے میں، جیسا کہ انہوں نے بتایا، یو۔ پی کے ایک مشہور ندوی عالم سے ایک سفارشی خط طلب کیا، لیکن مولانا نے یوں جواب دیا کہ "ہندوستان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلبہ کے علاوہ کسی اور ادارہ کے طلبہ میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ ان کے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ کے لیے کوئی سفارش لکھوں۔"

جب انہیں مولانا موصوف سے اس طرح کا مایوس کن جواب ملا تو انہوں نے کسی اور عالم سے سفارش لکھوا کر اپنے کاغذات جامعہ اسلامیہ بھیج دیے اور اللہ کے فضل سے ان کا داخلہ منظور ہو گیا اور وہ بھی حسن اتفاق سے میرے ہی ساتھی بنے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سلسلے میں مولانا ندوی کی یہ "لن ترانی" والی غیر حقیقت پسندانہ فخر کی قلعی دو سال کے اندر ہی اندر کھل گئی، کیوں کہ ندوۃ العلماء سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھیجے گئے طلبہ میں دو ایک کے علاوہ باقی سب کے سب سالانہ امتحان میں فیل ہو گئے اور دوسرے سال نکال دیے جانے کے ڈر سے کئی ایک خود ہی جامعہ اسلامیہ چھوڑ کر بھاگ گئے، جب کہ پی سعید مرکار، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے، ہر سال دورِ اول میں اچھے نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے۔

عالم اسلام میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ایک جانی پہچانی باوقار درسگاہ ہے۔ جہاں کچھ باصلاحیت علماء بھی پیدا ہوئے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ ہندوستان کے باقی تعلیمی ادارے صرف گھوڑوں کے اصطبل ہیں جہاں علم کی آبیاری کے بجائے جانوروں کی تربیت ہوتی ہے۔

جب کوئی شخص اِعجاب بالنفس یا خود پسندی کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ "ہم چنیں دیگرے

بیت'' کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا موصوف کو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ دیگر ہندوستانی تعلیمی اداروں میں سے نہ جامعہ سلفیہ بنارس یا فیض عام مئونظر آتا ہے اور نہ ہی جامعہ دارالسلام عمرآباد تک ان کی نظر پہنچ پاتی ہے اور نہ انہوں نے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ یا افضل العلماء کیرالا کو کوئی حیثیت دی ہے، حالانکہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے پہلے اور دوسرے سال میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مجموعی طلبہ کی کامیابی کا تناسب مشکل ہی سے ۳۰ ۴۰/فی صد پہنچا ہے جب کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے مجموعی طلبہ کی کامیابی کا تناسب ۸۰/ ۹۰ فیصد سے کم نہیں رہا۔

اِعجاب بالنفس میں مبتلا شخص دوسروں کو ہیچ سمجھنے اور خود پسندی میں غلو کرتے ہوئے اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ جو کچھ اپنے لیے اختیار کرتا ہے اسے وہ سو فیصد حق معلوم ہونے لگتا ہے اور اس خود پسندی کا مرض اسے اتنا موقع ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنی پسند کردہ چیز یا بات یا نظریہ کو حق وناحق کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش کرے، یہی حال مولانا موصوف کا ہے جس کی وجہ سے وہ خود تصوف کے دلدل میں پھنس گئے ہیں اور نہ جانے کتنوں کو پھنسائے ہیں!!

مولانا موصوف کا نظریۂ تصوف اختیار کرنا اور اسے اسلامی احسان کا خوبصورت نام دے کر اپنے زیر نگرانی شائع ہونے والے اخبار کے ذریعہ رواج دینا اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے دیگر تمام تعلیمی اداروں کو ہیچ سمجھنا ان کی پہلی خود پسندی تھی اور نظریۂ تصوف کو رواج دینا ان کی دوسری خود پسندی ہے۔

اس قسم کی خود پسندی انہیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی کہ مولانا الیاس صاحب نے یا مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے یا مولانا زکریا صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) جس تصوف کا تحفہ لوگوں کو عطا کیا ہے اُس کا آخری سرا اس مذموم شرک کے ڈانڈے سے ملا ہوا ہے جو ایک صوفی کے تمام کارِ خیر کو برباد کر دیتا ہے۔ ان بزرگ مرشدوں نے اپنے چیلوں کو تصورِ شیخ کے ساتھ ضربیں لگا کر ذکرِ الٰہی وفکرِ آخرت یا مراقبہ کرنے کی تعلیم دی، یہاں تک کہ نماز میں بھی تصورِ شیخ جیسے شرکِ جلی کو داخل کر دیا ہے۔

(دیکھیے فتاویٰ رشیدیہ طبع جدید مبوب ص ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰، وملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ج ۴ ص ۱۹، ۱۱۴)

نماز، ذکر الٰہی، اللہ کی تخلیق وقدرت کے بارے میں غور وفکر یا مراقبہ، بلاشبہ یہ سب کے سب عبادت کی مختلف اقسام ہیں، جنہیں صرف اللہ کے لیے اور اللہ ہی کے تصور واستحضار کے ساتھ انجام دیا جانا چاہیے۔ لیکن ان بزرگوں نے اپنے آپ کو یا ان کے چیلوں نے اپنے ان مرشدوں وبزرگوں کو طاغوتی شکل میں اللہ کی جگہ بٹھا کر شرک کا دروازہ کھول دیا ہے اور مولانا موصوف ان بزرگوں کے تصوف کو اپنے ''خانقاہ واخبار'' کے ذریعہ اس شرک کو پوری سرگرمی کے ساتھ مزید ترقی دے رہے ہیں۔ اگر ان چیزوں کی اصلاح کے لیے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ جیسے مصلح آدمی آواز اُٹھاتے ہیں تو انہیں بھی برا بھلا کہا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ رشیدیہ جلد اول، طبع قدیم ص ۷۰، ۷۴ و ۷۵، وطبع جدید مبوب ص ۷۸، ۷۹، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰)

اگر نماز یا مراقبہ الٰہی وذکر وفکر جیسی عبادت اللہ تعالیٰ کے تصور واستحضار یا خشوع وخضوع کے ساتھ انجام دی جائے تو اس میں اِخلاص پیدا ہوگا اور وہ عبادت خالص لوجہ اللہ کہلائے گی، جسے رسول اللہ ﷺ نے احسان کا نام دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''الإحسان أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك.....'' ''احسان یہ ہے کہ تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، لیکن اگر تم اسے دیکھنے کی کیفیت اپنے اندر پیدا نہ کرسکو تو کم از کم اس یقین کے ساتھ اور اس تصور واستحضار کے ساتھ اس کی عبادت کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

لیکن مذکورہ بالا تصوف میں جس کی اسلام نے قرآن وحدیث میں کہیں بھی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی اسلام میں اس شرک وبدعت کی کوئی گنجائش ہے، رسول اللہ۔۔ کے بتائے ہوئے احسان یا اخلاص کے برخلاف عبادت کا رُخ ہی بدل دیا گیا ہے، جس میں شرک کی مشق کرا کے اسے ایک مرغوب مشغلہ بنا دیا گیا اور ان کے چیلے حضرات اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ بہت

اچھے کام کر رہے ہیں ''وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا'' (سورہ کہف: ۱۸/ ۱۰۴)

اسلامی لباس میں ملبوس ہو کر اسلامی عقاید و اعمال کے خلاف تخریب کاری کرنے والے ایسے صوفی و پیر و مرشد حضرات نے مسلمان سلف صالحین کو ''صوفیاء'' کے بھاری بھرکم القاب دے کر خود اپنے آپ کو ان صلحاء کی صفوں میں چھپانے اور ان کے زمرے میں شامل ہونے کی ناپاک کوشش کی ہے، تاکہ وہ عامۃ المسلمین کو دھوکہ دے سکیں کہ تصوف کے میدان میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ علماء کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہے۔ حالانکہ امت مسلمہ کے سلف صالحین نے اس تصوف کو نہ کبھی اپنایا ہے اور نہ ہی قرآن و حدیث میں اس شرک کی کوئی گنجائش ہے۔

اگر بزرگانِ دین و صلحائے امت کے کچھ افراد کبھی تصوف کی کسی گلی کوچہ میں پائے گئے ہیں تو وہ کسی سازشی صوفی کی لچکدار باتوں سے دھوکہ کھا کر وہاں تک پہنچ گئے ہوں گے اور اسے ان کی لغزش سمجھا جائے گا جسے ان کی نیک نیتی اور اس کی برائی کی لاعلمی کی وجہ سے ممکن ہے اللہ تعالیٰ معاف کر دے، لیکن ان کی یہ لغزش قابل اتباع نہیں اور نہ ہی وہ لوگ دین کے لیے حجت و دلیل کا درجہ رکھتے ہیں، حجت صرف کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہے جس میں تصوف کی کوئی گنجائش نہیں۔

تصوف کو دین کا جزو قرار دینا اور اس کی آڑ میں شرک کی ترویج کر کے مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنا اسلام کے خلاف ایک خطرناک باطنی اور منصوبہ بند سازش ہے۔ شرک کا مسئلہ اتنا نازک و سنگین ہے کہ اس کے ارتکاب کرنے والوں کو کبھی بخشا نہیں جاتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ ......'' بے شک اللہ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' (سورۂ نساء: ۴/ ۴۸)

مرتکب شرک خواہ وہ کوئی معمولی انسان ہو یا کوئی مانے ہوئے بزرگ یا پیر و پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں، اللہ کسی کو نہیں بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کے خطرات و سنگینی کا احساس دلانے کے لیے خود اپنے پیارے نبی محمد ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ''لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ'' ...... بے شک اگر آپ نے بھی شرک کا ارتکاب کیا تو آپ کے تمام کیے کرائے برباد

ہو جائیں گے۔'' (سورۂ زمر: ۳۹/ ۶۵)

اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو عقیدہ کے سلسلے میں سمجھ بوجھ عطا فرمائے اور تمام مسلمانوں کو تصوف کی تباہ کاریوں سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو اس بات کی توفیق دے کہ اپنی مشہور خانقاہ نما شرک کے اڈے کو ختم کر سکیں اور اسے درسِ نظامیہ کی طرح ایک منظم مدرسہ میں تبدیل کر سکیں جہاں صوفیاء پیدا ہونے کے بجائے علماء وفضلاء پیدا ہوں اور تصورِ شیخ کی تعلیم کے بجائے تصورِ خدا وخشوع وخضوع کی تعلیم ہو۔

۴۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے چوتھے دوست مگر مخلص ساتھی جناب عبداللہ مراد ہیں۔ جن کا تعلق پاکستان سے ہے، لیکن وہ بعد میں سعودی شہریت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ہمارے ریاض کے ساتھیوں میں سے ہیں اور جب مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا افتتاح ہوا تو انہوں نے بھی المعہد العلمی سے منتقل ہو کر اس جامعہ میں داخلہ لے لیا تھا۔ دورانِ تعلیم اور فراغت کے بعد بھی ان سے میرے بہت اچھے اور خوشگوار تعلقات رہے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالکریم مراد جامعہ اسلامیہ میں میرے استاذ بھی رہے، جن کی شفقت مجھے برابر حاصل رہی، یہاں تک کہ جب میں نے اپنی اہلیہ کو مدینہ منورہ لے جانے کے لیے ویزا کی درخواست دی تو بطورِ کفیل انہی کا نام دیا اور انہوں نے بخوشی کفالت نامہ پر دستخط کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنے دین حنیف کی خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ توفیق وحوصلہ دے۔

۵۔ جامعہ اسلامیہ کی میری تعلیمی زندگی میں ایک ایسا دوست بھی پایا جنہیں دوست کہنے پر خوشی ہونے کے بجائے افسوس ہوتا ہے۔ یہ ہندوستان ضلع ندیا کے رہنے والے تھے۔ ان کے ساتھ مکہ مکرمہ میں میرا تعارف ہوا تھا۔ انہوں نے جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا تو ہم دونوں کے تعلقات اور بڑھے، لیکن تلخ تجربات بھی ہوئے اور ان کے اندر استحصال واستغلال کا عنصر کارفرما نظر آیا۔

مدینہ منورہ میں دو سال گزارنے کے بعد جب میں نے اپنی اہلیہ کو مدینہ منورہ لے جانے کے لیے ہندوستان کے سفر کا پروگرام بنایا تو ندیاوی صاحب کو میں نے دوستانہ تعلق کے ناطے

یہ ذمہ داری سونپی کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر میرے لیے اہلیہ کے ساتھ رہنے کے قابل ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر طے کر کے تیار رکھیں تاکہ اہلیہ کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد رہائش کی کوئی پریشانی نہ ہو، لیکن انہوں نے میرا یہ کام انجام نہیں دیا اور بعد میں مجھے خود مکان تلاش کرنا پڑا۔

(الف) جب میں اپنی اہلیہ کو لانے کے لیے ہندوستان روانہ ہونے لگا تو ان صاحب نے بھی میرے ذمہ ایک کام لگا دیا کہ میں ہندوستان پہنچنے کے بعد اپنے گھر جانے سے پہلے سیدھا ان کے گھر جاؤں اور ان کے والد صاحب کو ان کے تحفے تحائف پہنچا دوں اور کچھ نقد پیسے ان کی والدہ کے ہاتھ میں اس طرح پہنچا دوں کہ ان کی والدہ کے علاوہ اور کوئی نہ جان پائے۔

اللہ کے فضل سے میں نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا۔ جب ان کے گھر سے میں خود اپنے گھر روانہ ہونے لگا تو اتفاق سے مجھے سو کا نوٹ توڑانے کی ضرورت پڑ گئی، کیوں کہ راستہ میں خرچ کرنے کے لیے میرے پاس ریزگاری نہیں تھی۔ میں نے ان کے والد کو سو کا ایک نوٹ دے کر کہا اگر آپ کے پاس اس کا چینج ہو تو دے دیں ورنہ گاؤں کے کسی شخص سے یا کسی دوکان سے تبدیل کرا دیں۔

لیکن سوئے اتفاق سے نہ خود ان کے پاس سو کا چینج ملا اور نہ انہیں گاؤں میں کسی سے چینج مل سکا۔ آخر انہوں نے مجھے میرا سو کا نوٹ واپس کر دیا اور ساتھ ہی اپنے پاس سے تیس یا چالیس روپے مجھے یہ کہہ کر دینے لگے کہ اس سے کام چلا لیجیے گا۔ میں نے بھی راستے کی ضرورت کے پیش نظر ان کا پیش کیا ہوا پیسہ رکھ لیا کہ راستے میں اجنبی لوگوں سے سو کا چینج مانگنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ان کا پیسہ تو رکھ لیا تھا لیکن دل میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ بعد میں گھر جا کر یہ پیسہ منی آرڈر کے ذریعہ واپس کر دوں گا۔

(ب) گھر پہنچنے کے چند روز بعد یہی ندیاوی صاحب نے میرے نام مدینہ منورہ سے اس طرح کا ایک خط لکھا کہ:

"جناب عطاء الرحمن صاحب! آپ پھر سے میرے گھر جا کر میرے والد صاحب کو

ساتھ لے کر فلاں مدرسہ جائیے جہاں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں مدرسہ کے ناظم صاحب سے مل کر میری فراغت کی سرٹیفکٹ حاصل کر کے اپنے ساتھ ضرور لائیں۔''

مجھے دوستانہ تقاضا پورا کرنا پڑا اور ان کے کہنے کے مطابق پھر ان کے گھر گیا۔ چونکہ دوسری بار ان کے گھر جانے کی وجہ سے مجھے ان کے والد صاحب کے سابق دیے ہوئے پیسے سے بھی کچھ زیادہ ہی خرچ کرنا پڑا، اس لیے ان کے والد صاحب کے دیے ہوئے پیسے واپس بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا اور نہ ہی زائد خرچہ کا ان سے یا ان کے والد سے مطالبہ کیا۔

میں نے سعودی عرب واپس جا کر ندیاوی صاحب کو ان کے سرٹیفکٹ کے بارے میں نیز ان کے سپرد کردہ دیگر کاموں کے بارے میں جو کچھ کرنا پڑا، انہیں بتا دیا۔ لیکن دوستانہ تعلق کی بنا پر سفر کے اخراجات کے بارے میں کچھ نہیں کہا، تاہم اس کے بعد میں مجھے ندیاوی صاحب کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا کہ شاید انہیں ان کے والد نے خط لکھ دیا تھا کہ محمد عطاء الرحمن آیا تھا اور تحفے تحائف دے گیا اور جاتے وقت انہیں تیس چالیس روپے دے کر رخصت کیا۔ کاش وہ ان باتوں کو ذرا اس طرح تفصیل سے لکھتے کہ عطاء الرحمن نے جاتے وقت سفری ضروریات کے پیش نظر سو کا نوٹ چینج کرنے کے لیے دیا تھا، کسی سے چینج نہ ملنے کی وجہ سے اس کا نوٹ واپس کر دیا اور راستہ کی ضرورت کے لیے اپنی طرف سے تیس چالیس روپے دے کر رخصت کیا۔ وہ اگر اس تفصیل سے لکھے ہوتے تو شاید ندیاوی صاحب کو غلط فہمی نہیں ہوتی، مگر ہوا یہ کہ انہوں نے اپنے والد صاحب کے دیے ہوئے چند روپیوں کی وجہ سے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا کہ میرے والد سے سفر خرچ کیوں لیا اور یہ نہیں سوچا کہ اگر میں نے دوبار ان کے گھر جانے آنے کا سفر خرچ لیا ہوتا تو انہیں اس سے کئی گنا زیادہ پیسہ دینا پڑتا، پھر سفر کی مشقت اور وقت خرچ کرنے کا معاوضہ اس کے علاوہ ہوتا۔ نیز انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے ذمہ جو کام دیا اسے انہوں نے کیوں پورا نہیں کیا؟ جب کہ ان کی طرف سے میرے ذمہ لگائے کاموں کو میں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

۶۔ مدینہ منورہ میں ہندوستان ضلع مرشد آباد، مغربی بنگال کے ایک شریف ومتوضع مزاج

دوست جناب نصرۃ اللہ صاحب ہیں۔ یہ بھی کچھ روز وہاں رہنے کے بعد سعودی شہریت لے چکے ہیں اور وہیں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ نصرۃ اللہ وہی صاحب ہیں جن کا ذکر ''سعودی عرب ریاض کے المعہد العلمی میں داخلہ'' کے عنوان کے تحت گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ انہوں نے ہی مجھے پہلی بار مکہ مکرمہ میں فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ سے ملایا تھا اور میرے ریاض جانے کے لیے شیخ کو ایک ورقہ دینے کی سفارش کی تھی۔

کسی کو کسی سے ملانے میں یا کسی کام کے لیے سفارش کرنے میں عام طور پر کچھ خیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت معمولی سا کام ہے، لیکن وہی معمولی کام کسی کے حق میں کبھی بہت بڑا احسان بن جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جناب نصرۃ اللہ صاحب کی وہ معمولی سی خیر خواہی کا جذبہ میرے لیے بہت بڑا احسان ثابت ہوا۔ سعودی عرب کے ریاض و مدینہ منورہ میں مجھے جم کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو اسباب مہیا ہوئے وہ جناب نصرۃ اللہ صاحب کی اسی خیر خواہی کے نتیجے میں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور انہیں دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔

۷۔ اسی مرشد آباد ضلع کے میرے ایک دوسرے ملنسار دوست جناب ابوعمر فضل الحق صاحب ہیں۔ یہ بھی کچھ روز سعودیہ میں رہنے کے بعد وہاں کی شہریت حاصل کر چکے اور حرم مکی میں درس دیتے ہیں۔ ہم دونوں ایک سال مکہ مکرمہ کے مدرسہ دارالحدیث میں پڑھتے رہے۔

میرے ان دونوں صاحبان (۶۔۷) کے ساتھ اچھے تعلقات رہے۔ ان دونوں کے برتاؤ سے مجھے کافی اطمینان رہا، لیکن سابق الذکر ندیاوی صاحب کے ساتھ ان کا ایک برتاؤ مجھے قدرے ناپسند بھی معلوم ہوا تھا۔ کوئی شخص دوسری شادی کرنے کا شرعاً حق رکھتا ہے۔ ندیاوی صاحب نے بھی دوسری شادی کرنے کے ارادے سے کسی مصری عورت کا فوٹو منگوا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ شاید یہ فوٹو ندیاوی صاحب نے کسی موقع پر نصرۃ اللہ صاحب و فضل الحق صاحب کو دکھا کر ان دونوں سے کوئی مشورہ طلب کیا ہوگا، لیکن ان دونوں نے ندیاوی کے اس

فوٹو رکھنے کو بہت بڑا اخلاقی جرم قرار دے کر جامعہ اسلامیہ کے ایک ذمہ دار کو اس کی شکایت کردی اور ان کے تصفیہ کی مجلس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔

یہ دونوں چاہتے تھے کہ فوٹو رکھنے کے جرم میں ندیاوی صاحب کو کچھ سزا ملنی چاہیے۔ میں نے مجلس میں کہا کہ شادی کے ارادہ کے پیش نظر یہ کوئی جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ سزا کے مستحق ہوں۔ بہرحال جامعہ کے ذمہ دار نے دونوں فریق کو سمجھا کر اس معاملہ کو رفع دفع کر دیا، پھر ان کے آپس کے تعلقات دھیرے دھیرے کسی قدر ٹھیک ہو گئے اور آپس میں علیک سلیک ہوتی رہی۔

۸۔ دوستوں کے تذکرہ کا خاتمہ بالخیر کے طور پر یہاں ایک اور دوست کا تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں تا کہ یہ موضوع ادھورا نہ رہ جائے۔ یہ ہیں جناب محمد لقمان صاحب سلفی۔ آپ بہار ضلع چمپارن کے رہنے والے ہیں۔ دربھنگہ سے پڑھ کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا تھا۔ ایک سال میرے کلاس فیلو بھی رہے۔ تعطیلات میں ذمہ داران جامعہ اسلامیہ نے خواہش مند طلبہ کو ڈبل امتحان دینے کا اختیار دیا تھا۔ چنانچہ جناب لقمان صاحب کو مجھ سے ایک کلاس آگے ہونے کا اچھا موقع مل گیا اور مجھ سے ایک سال قبل فارغ بھی ہو گئے۔

فراغت کے بعد انہیں ریاض دارالافتاء میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور یہیں سے انہیں ماجستر یا ایم۔ اے میں داخلہ لینے اور اس کی تیاری کر کے امتحان دینے کا بھی اچھا موقع ملا نیز یہیں سے انہوں نے ڈاکٹریٹ بھی کر لی۔ پھر کچھ روز بعد سعودی شہریت لے کر ریاض ہی میں رہنے لگے۔

ان سے میرا اچھا تعلق رہا۔ میرے بال بچوں کے بھی ان کے بال بچوں کے ساتھ اچھے مراسم رہے۔ جامعہ اسلامیہ سے میری تعلیم ختم ہونے کے بعد جب دارالافتاء کی طرف سے تدریسی ملازمت کے لیے میں نے کچھ دوڑ دھوپ کی تو لقمان صاحب نے اس موقع پر میرا ہر ممکن تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے حسن برتاؤ کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور ان سے اپنے دین کا زیادہ سے زیادہ کام لے۔

مدینہ منورہ کے قبرستان

جنت البقیع سے ایک خاندانی رشتہ

بال بچوں کو مدینہ منورہ لے جانے کے بعد اللہ کے فضل وکرم سے وہاں کرایہ کے مکان میں اچھی طرح رہنے لگا تھا۔ پہلا سال بال بچوں کو اڑوس پڑوس اور مدینہ منورہ کے ملنے والوں سے مانوس ہونے میں گزرا۔ پھر وہاں سکون کی زندگی گزرنے لگی اور اسی پُرسکون ماحول میں جامعہ اسلامیہ کی تعلیم جاری رہی۔ جامعہ اسلامیہ سے مجھے جس قدر وظیفہ ملتا تھا اسی سے کفایت شعاری کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندوستان میں ایک لڑکی مسعودہ اور ایک لڑکا مسعود عطا کیا تھا اور مدینہ منورہ میں تین لڑکیاں: سعیدہ، سعاد (اولیٰ)، سعاد (ثانیہ) پھر سعود نام کے ایک لڑکے سے نوازا، لیکن سعاد (اولیٰ) چار پانچ ماہ کی عمر ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی إنا لله وإنا إليه راجعون۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ اُسے لُو لگ گئی تھی اور مدینہ منورہ کے ہسپتال پہنچتے پہنچتے اس کی روح پرواز کر گئی جس کا مجھے احساس تک نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو انہوں نے مایوس کن خبر سنائی اور ایک پرچی پر اس کے موت کی سرٹیفکٹ لکھ دی۔

اب تک گھر والوں کو صرف اس کے بیمار ہونے اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا علم تھا، نئی بات کی انہیں کوئی خبر نہیں تھی۔ میرے لیے مسئلہ ذرا پیچیدہ ہوگیا۔ اب نئی حالت میں اس لختِ جگر کو بیگم کے سامنے کیسے پیش کروں؟ اسے گھر لے جانے پر پورا گھر ماتم کدہ بن جائے گا۔ جہاں تک اپنا سوال تھا تو میں نے صبر کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور دل میں یہ

طے کرلیا کہ بیگم کو بار بار رونے کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے۔

چنانچہ میں اسے اپنی گود میں لے کر گھر کے بجائے سیدھا مدینہ منورہ کے جنت البقیع نامی قبرستان کی طرف چل دیا۔ وہاں کفن دفن کا سارا انتظام ہوتا ہے۔ تکفین وتدفین کے ذمہ داران کے تعاون سے اسے غسل دلا کر کفن پہنایا۔

قبرستان پہنچنے تک تو میں نے صبر سے کام لیا، لیکن جوں ہی غسل وکفن کے مرحلہ تک پہنچا تو صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹنے لگا اور آنسو پر کنٹرول تو درکنار، ہچکیوں کے ساتھ رونا آ گیا۔ بعض حاضرین کے سمجھانے سے قدرے ہچکیاں تھمیں تو انہیں لوگوں کی معیت میں اس پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور جنت البقیع کی ایک تیار قبر میں اسے سپردِ خاک کر دیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس طرح اس مقدس سرزمین مدینہ منورہ سے عقیدہ وعلمی رشتہ کے ساتھ ساتھ ہمارے خون کا رشتہ بھی جوڑ دیا، کاش کہ اللہ تعالیٰ اس مقدس شہر کی پاک زمین کو ہمارے لیے بھی آخری بچھونا بنائے۔

کفن سے فارغ ہو کر میں گھر کی طرف لوٹا تو دماغ پر فکر وغم کا ایک بہت بڑا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب بیوی کا سامنا کیسے کروں؟ گھر سے نکل کر ہسپتال چلا تھا تو میری بچی میری گود میں تھی۔ اب خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر بیوی کیا سمجھے گی اور کیا سوال کرے گی؟ پھر میں اسے کیا جواب دوں گا؟ اس کے سامنے مجھے کس طرح پیش آنا چاہیے؟ بچی کے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے اور اسے باہر ہی باہر قبرستان لے جا کر سپردِ خاک کر آنے کی خبر اسے کس طرح دوں؟

یہ سب سوالات دماغ میں گونج رہے تھے اور میں دھیرے دھیرے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا نیز ان سوالات کے جواب بھی سوچتا جا رہا تھا۔ میں نے طے کرلیا کہ ہر ممکن طریقے سے اپنے چہرے سے افسردگی کے آثار ختم کر کے گھر میں داخلہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ راستہ کے بازو میں ایک پانی کی نلکی سے منہ ہاتھ دھو کر چہرہ پر تازگی وبشاشت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

اب اللہ اللہ کر کے گھر میں داخلہ ہوا اور بیگم کو مخاطب کیا کہ روشن! تم لوگ بچی کی

خیریت وعافیت کے لیے دعا کرتی رہو۔بیگم کی طرف سے فوراً سوال ہوا کہ بچی کیسی ہے؟ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا کہ اس وقت تو اللہ کے فضل سے اچھی ہی چھوڑ آیا اور ان شاء اللہ تمہیں اچھی ہی ملے گی، تمہاری دعا اور صبر کی سخت ضرورت ہے۔ہم اور ہمارے بچے سب اللہ کی امانت ہیں اور جب بھی اللہ اپنی امانت واپس مانگے ہمیں خوشی خوشی اس کی امانت واپس کردینی چاہیے۔

اس آخری جملہ پر بیوی سہم سی گئی اور سوال کر بیٹھی کہ بتاؤ نا...... میری بچی کیسی ہے؟ کہاں ہے؟ کہاں چھوڑ آئے اور کیوں چھوڑ آئے......؟ میں نے کہا صبر کرو، میں نے پہلے ہی دعا اور صبر کے لیے کہا تھا، صبر کا وعدہ کرو تو میں پوری بات بتاؤں۔اس نے کہا ٹھیک ہے بتائیے۔اس کے بعد میں نے اسے پوری کہانی سنائی، میں لڑکی کو گود میں لیے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔لڑکی نے راستہ میں کسی بے چینی کا اِظہار نہیں کیا اور نہ ایسی کوئی حرکت کی جو جاں کنی کے وقت ہوتی ہے۔

میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اطمینان سے میری گود میں سو رہی ہے۔ہسپتال پہنچ کر اسے ڈاکٹر کے سامنے بڑھایا تو انہوں نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا، پھر ایک آلہ سینے پر رکھ کر چیک کیا اور کہا کہ اب علاج کی ضرورت نہیں ہے۔میں نے کہا کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب! اس کے ہاتھ پاؤں سب نرم و ملائم ہیں، کوئی چیز ابھی اکڑی نہیں، پھر آپ یہ کیا بات کہہ رہے ہیں! انہوں نے کہا کہ یقین جانیے، لڑکی کا انتقال ہو چکا ہے۔اسے لُو لگ گئی تھی، اب دفن کفن کا انتظام کیجیے۔میں نے إنا لله وإنا إليه راجعون پڑھا۔

اب میرے لیے آنسو، صبر اور دعا کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے ایک پرچی پر موت کی سرٹیفکٹ لکھ دی تاکہ اسے تجہیز و تکفین کمیٹی کو دکھاؤں اور پرچی دیکھ کر وہ لوگ بلا تردد اسے دفن کے لیے قبول کرلیں۔

یہ ساری باتیں سنتے ہی بیگم کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا۔آنسو کا فوارہ جاری ہو چکا تھا۔ادھر میں اسے صبر کی تلقین کرتا جا رہا تھا اور اس کا وعدہ یاد دلا رہا تھا، پھر بھی ہلکی آواز سے روتی ہوئی

سوال کر بیٹھی: کہاں ہے میری بچی؟ میں نے کہا: دیکھو روشن! میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں تین چار بار رلاؤں، ایک تو یہاں سے ہسپتال لے جاتے وقت تم نے روتے ہوئے اسے رخصت کیا، پھر اگر یہاں لاتا تو میت دیکھتے ہی رو پڑتیں، پھر یہاں سے میت اُٹھا کر قبرستان لے جاتے وقت روتی اور پھر دفنا کر گھر لوٹتے وقت اور ایک بار روتی۔

چنانچہ میں اسے باہر ہی باہر کفن دفن کر کے گھر لوٹا ہوں تا کہ تمہیں صبر کی تلقین کروں۔ اب ان شاء اللہ تم اسے جنت ہی میں دیکھ سکو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے خوش خبری دی ہے کہ بچپن میں انتقال کرنے والے بچے اللہ سے سفارش کر کے اپنے والدین کو جنت میں لے جائیں گے۔ لہٰذا تم خوش نصیب ہو کہ جنت کی سفارش کے لیے اپنی ایک لخت جگر کو مدینہ منورہ کی پاک زمین میں امانت رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے آخرت کا توشہ بنائے۔

اس طرح کی تلقین سے بیوی کے رونے کی رفتار قدرے کم ہوئی۔ صبر کے آثار چہرہ پر ظاہر ہونے لگے۔ یہی حال دیگر بچوں کا رہا اور دھیرے دھیرے ہماری گھریلو زندگی نارمل ہوتی گئی۔ پھر ہم روزمرہ کے مشاغل میں لگ گئے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے سند فراغت

(۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء)

اب مدینہ منورہ میں پڑھائی کے صرف دو ڈھائی سال باقی رہ گئے تھے۔ جامعہ اسلامیہ کا کورس اس وقت صرف کلیہ تک محدود تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ذرا جم کر پڑھائی کروں گا تا کہ آخر میں تخصص اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے شعبے کھل جائیں تو ان میں بھی داخلہ لے سکوں۔

جب کلیہ شریعہ کے آخری سال میں پہنچا تو اس بات کا شدید انتظار رہا کہ تخصص کھلنے کا اعلان ہو۔ اس سلسلے میں ذمہ داران کو آمادہ کیا، یاد دہانی کے لیے آخری کلاس کے طلبہ کے وفود بار بار رئیس الجامعہ سے ملے اور اس کے لیے مشترکہ درخواست بھی دی، لیکن رئیس الجامعہ کی طرف سے دلی خواہش ظاہر ہونے کے باوجود ہمارے آخری وقت تک جامعہ اسلامیہ میں تخصص یعنی ایم۔ اے یا ماجستر کا انتظام نہیں ہوسکا۔ جس پر ہمیں بہت افسوس رہا۔

آخری کلاس میں اگرچہ بہت زیادہ محنت کرنا چاہا، تا کہ اچھے نمبرات سے کامیاب ہو سکوں، لیکن انجمن طلبہ کی انتخابی مہم میں اپنے ہم خیال طلبہ کو کامیاب کرانے کے لیے کچھ ضروری تعاون میں مصروف رہنے کی وجہ سے درسی کتابوں کا زیادہ جم کر مطالعہ نہ کرسکا۔ سالانہ امتحان الشھادۃ سر پر آن پڑا۔ آٹھ دس روز مزید مطالعہ کا موقع مل جاتا تو شاید اطمینان بخش تیاری ہوجاتی۔ بہر حال امتحان اپنے وقت پر شروع ہوگیا اور بارہ تیرہ روز تک جاری رہا۔ جس حد تک ممکن ہوا اچھا ہی لکھنے کی کوشش کی گئی۔ اللہ کے فضل سے نمبرات بھی کوئی خراب نہیں آئے، لیکن فرسٹ ڈویژن آنے کے باوجود صرف دس پندرہ نمبرات کی کمی کی وجہ سے درجہ

''ممتاز'' نہیں پاسکا اور ''جید جدا'' پر ہی صبر کرنا پڑا۔ بہرحال جامعہ سے سنہ ۱۳۸۸ھ مطابق سنہ ۱۹۶۸ء میں سند فراغت حاصل ہوگئی۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے سند فراغت لے کر مجھے بال بچوں سمیت ہندوستان واپس ہونا تھا، اس لیے آخری سال زیادہ کفایت شعاری و بچت کر کے بحری جہاز کے ٹکٹ کا انتظام کرلیا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ دارالافتاء ریاض کا مبعوث بن کر کسی جگہ تدریسی کام میں لگ جانے کی کوشش بھی جاری تھی۔

جامعہ اسلامیہ کی طرف سے حسب صلاحیت کچھ فارغین کے نام دارالافتاء بھیج دیے جاتے ہیں۔ میرا نام بھی انہی امیدواروں کی فہرست میں شامل تھا۔ پہلے تو دارالافتاء سے جواب ملا کہ امسال کی مطلوبہ تعداد مکمل ہوگئی ہے، بروقت کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میں ہندوستان واپس جانے کی تیاری میں لگ گیا، اتنے میں اچانک ریاض سے بلاوا آ گیا کہ ملازمت کے لیے طائف میں مفتی صاحب سے مل کر دارالافتاء ریاض پہنچ جاؤں۔

میری طرح میرے ایک ساتھی جناب پی سعید مرکار کا نام بھی جن کا ذکر (مدینہ منورہ کی تعلیمی زندگی میں چند کھرے کھوٹے دوستوں کی پہچان) کے عنوان کے تحت آ چکا ہے، امیدواروں کی فہرست میں شامل تھا۔ چنانچہ ہم دونوں طائف پہنچ کر مفتی صاحب سے ملے، لیکن وہاں ہمیں ایک افسوس ناک واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔ مفتی صاحب نے صرف میرا تقرر منظور کیا اور باقی کارروائی کی تکمیل کے لیے مجھے ریاض جانے کے لیے کہا۔ ہم دونوں مفتی صاحب کے یہاں سے رخصت ہو کر بس اسٹینڈ کے ایک مقہی میں کچھ دیر ٹھہرے۔ کچھ چائے پانی کرنے کے بعد میں وہاں سے ریاض کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ سعید مرکار مذکور کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ میرے ایک مخلص دوست بھی ہیں۔ ہم دونوں کافی عرصہ ایک ساتھ رہے اور اس ملازمت کے لیے ہماری جدوجہد بھی ایک ساتھ چلتی رہی۔ اب ہم دونوں میں سے صرف ایک کی ملازمت منظور ہونے پر ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑ رہا تھا۔

ہم دونوں اس جدائی سے متاثر تھے، ان کے دل پر جو اثر پڑا ہوگا وہ تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن میرے دل پر بھی اس کا گہرا اثر تھا اور وہاں سے ریاض روانہ ہوتے وقت بے اختیار مجھے رونا آ گیا۔ وہ مجھے سمجھا کر رخصت کر رہے تھے کہ عطاء بھائی! اللہ کو جو منظور تھا وہی ہوا، ان شاء اللہ میرا ابھی کوئی انتظام اللہ تعالیٰ کر ہی دے گا۔ میں نے کہا کہ بھائی سعید! ہم دونوں ایک ساتھ رہے سہے اور ایک ہی ساتھ امید لے کر چلے تھے، لیکن افسوس کہ ہم اس طرح راستے ہی میں بچھڑ رہے ہیں۔ خیر اب میں جا رہا ہوں، لیکن میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد آپ کا بھی کوئی انتظام کر دے۔ اس طرح آنسو بہاتے ہوئے میں ان سے جدا ہو کر بس کے ذریعہ ریاض روانہ ہو گیا اور وہ وہاں سے مدینہ منورہ لوٹ گئے۔

ریاض پہنچتے ہی میرا انٹرویو ہوا۔ کئی افراد کی مجلس میں مجھ سے سوالات کیے گئے، باری باری ہر ایک سوال کا جواب دیتا رہا۔ ایک رکن مجلس کمیونزم پر سوال کر بیٹھا۔ میں نے جواب تو دیا، لیکن میرا جواب زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ اس پر ریمارک لگ گیا کہ آؤٹ نالج میں قدرے کمزور ہے۔ پھر بھی چونکہ مفتی صاحب نے منظوری دے دی تھی اس لیے انہوں نے اس کمزوری کو نظر انداز کر کے مجھے کامیاب قرار دے کر مغربی افریقہ کے ملک نائیجیریا میں دعوت وتدریس کا کام کرنے کی ذمہ داری سپرد کر دی اور میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ کرا کے ملازمت اگریمنٹ پر دستخط لے کر مجھے نائیجیریا روانہ ہو جانے کی ہدایت کی۔

دارالافتاء کی ضروری کارروائی مکمل کر کے میں مدینہ منورہ واپس ہو گیا۔ اس سے قبل ہندوستان واپسی کے لیے بحری جہاز کے ٹکٹ کے لیے جو پیسہ جمع کیا تھا وہ واپس لے لیا۔ پھر دو ہفتے کے اندر اندر بال بچوں کو ساتھ لے کر ۱۹۶۸ء کے اواخر میں نائیجیریا روانہ ہو گیا اور اس طرح اللہ کے فضل وکرم سے میری علمی زندگی ایک عملی زندگی میں بدل گئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میری بقیہ عملی زندگی میں بھی کامیاب بنائے اور اپنے مذہب وملت اور پوری انسانیت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تعلیمی زندگی سے متعلق یہ آپ بیتی میں نے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھنے کے کئی سال

یادداشت	تاریخ	صفحات نمبر

صفحات نمبر	تاریخ	یادداشت

Samundar men chhalang

Written By

Shaikh Muhammad Ataur Rahman Madni
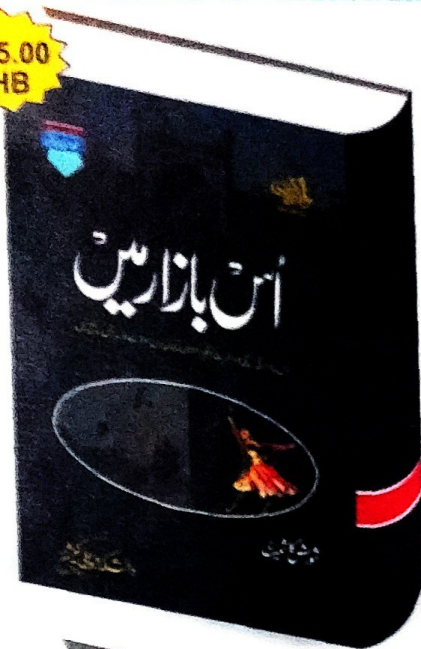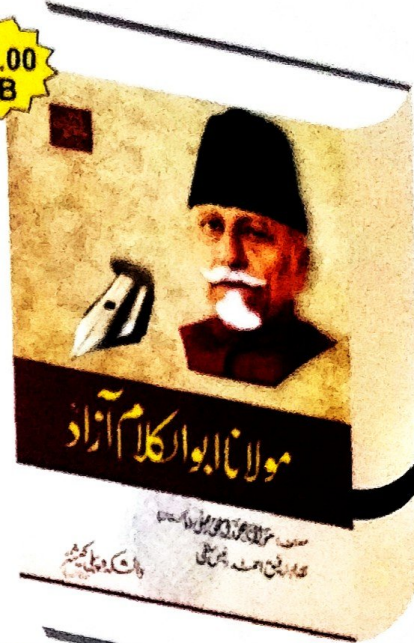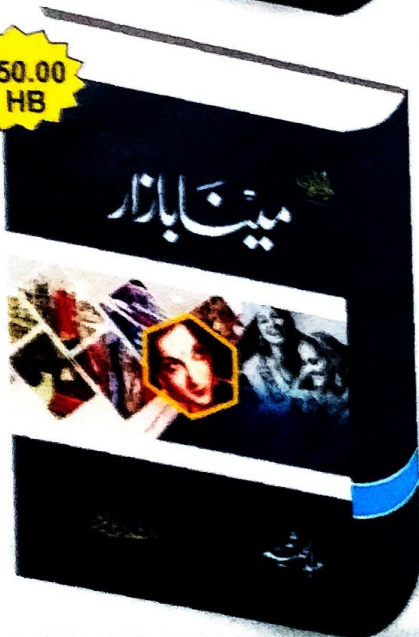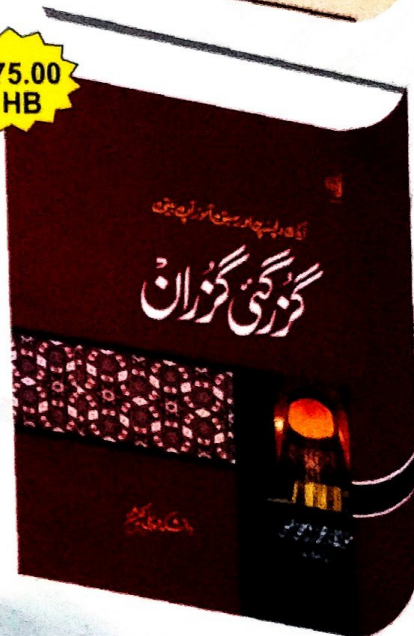
DANISH KADA PUBLICATIONS

Head Off.: 2982, PGF, NeelKanth Street
Qaziwara, Daryaganj, New Delhi-11002
Branch: Domanpura, Teliyana, Mau N.B-275101 (U.P.)
Email: danishkadamau@gmail.com
9889123129, 336010224

Current Price
450/-